فلم پر مبنی سنسنی خیز کہانی

یونیکو

ایک جاپانی لڑکی کی کہانی اُسی کی زبانی

ترتیب کار

برنارڈ پار

مترجم

مسز ایس تاج

ناشرین

مسیحی اشاعت خانہ ۳۶ فیروز پور روڈ لاہور نمبر ۱۶

طابع ——— اے۔ این والٹر

مطبع ——— طفیل آرٹ پرنٹرز لاہور

تعداد ——— ایک ہزار

بار ——— چہارم

قیمت ——— ۶ روپے

سنہ ۱۹۸۶ء

YONEKO was first published in the
United States by the Moody Press.

Copyright © 1976 by
THE MOODY BIBLE INSTITUTE OF CHICAGO

پہلا باب

میرا نام یونیکو ہے جس کے معنی "مسرت کی دخترِ نیک اختر" یا "خوشی کی بیٹی" ہے۔ میری نانی اماں نے قدیم جاپانی ناموں میں اس نام کا انتخاب اس لئے کیا تھا کہ ان کی دانست میں یہ لفظ اس دعا اور تمنا کا حامل تھا کہ مجھے تا عمر کسی چیز کی کمی نہ ہوگی اور مجھے بتایا گیا ہے کہ انہوں نے یہ نام رکھتے ہوئے جذبات سے عاری سپاٹ لہجے میں کہا تھا:

"یہ نام اس کے لئے عین مناسب رہے گا اور اٹھاسی سال کی طویل اور قابلِ احترام عمر پانے میں اس کا ممد و معاون ہوگا۔"

غرض میں نے یونیکو یعنی خوشی کی بیٹی کے نام سے ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جہاں خاندان کے تمام افراد امن چین اور ہنسی خوشی زندگی بسر کرتے تھے۔ کسی غم سے نڈھال ہو کر منہ لٹکائے پھرنا ان کا شیوہ نہ تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں چھوٹی تھی تو چنچل سی بچی تھی اور خوب خوش رہا کرتی تھی۔ بزرگوں نے مجھے بتایا ہے کہ بچپن ہی سے مجھے والدین کی مدد کرنے کا شوق تھا، یعنی اس سے بیشتر کہ میں سکول جانا شروع کرتی مجھے گھر کے کام کاج میں ان کا ہاتھ بٹانے کی خواہش تھی، لہٰذا میری والدہ مجھ سے چھوٹے چھوٹے کام

کروا لیا کرتی تھیں۔ مثلاً میں صرف سامنے والا برآمدہ صاف کر دیا کرتی تھی جبکہ اس کے برعکس میری بڑی بہن یوریکو کو خاصہ کام کرنا پڑتا تھا اور اس کی کئی ذمہ داریاں تھیں۔ نیز ہر کام کو ڈھنگ سے کرنے اور رہن سہن کے متعلق بھی یوریکو کی بڑی باقاعدگی سے کڑی تربیت کی جاتی تھی، جس کا مطلب یہ ہے کہ ذرا سی کوتاہی پر اُسے والدہ کی گھرکیاں بھی سننی پڑتی تھیں۔

لیکن میرا معاملہ یوریکو سے بالکل مختلف تھا۔ میں والدہ کی لاڈلی بیٹی تھی اور بڑا ہو جانے پر بھی اُن کے جیتے جی اُن کی نظر میں بچی ہی رہی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مجھ سے یہ توقع نہیں کرتی تھیں کہ گھر کے کاموں میں اُس حد تک مدد امداد کروں جس حد تک بڑے بہن بھائی کرتے تھے۔ دیگر جہاں کہیں وہ جاتی تھیں مجھے ساتھ لے جاتیں۔ دکانوں پر خریداری کرتے وقت بھی میں اُن کے ساتھ ساتھ ہوتی۔ اور وہاں پر ان سے ملنے والی عورتیں ان سے اکثر یہ کہتیں:

"تمہاری بیٹی بہت خوبصورت ہے۔"

اور میری والدہ مخصوص جاپانی انداز میں کسر نفسی سے کام لیتے ہوئے کہتیں:

"نہیں۔ اس میں ایسی کوئی خاص بات نہیں۔ البتہ تمہاری بیٹی یقیناً دلکش ہے۔"

تاہم ایسا کہتے ہوئے ان کی شگفتہ مسکراہٹ اس بات کی غمازی کرتی کہ وہ بیٹی کے متعلق کہنے والے کی رائے سے پوری طرح متفق ہیں۔

میرے والد صاحب اس بات کے قائل تھے کہ ایسی باتیں مجھے بگاڑ دیں گی، لہٰذا انہیں یہ سب کچھ خاصہ ناگوار گذرتا تھا۔ اور انہوں نے متعدد بار احتجاج بھی کیا، لیکن میری والدہ ہمیشہ انکے اعتراضات کو فوراً پسِ پشت ڈال دیا کرتی تھیں۔ اور حالانکہ وہ فرض شناس جاپانی بیوی تھیں اور میرے والد کی ہر خواہش کا احترام کرتی تھیں، لیکن ان کے نزدیک میں اس قدر خصوصی اہمیت کی حامل تھی کہ وہ گمان بھی نہ کر سکتی تھیں کہ کسی کو مجھ میں کوئی خامی نظر آ سکتی ہے اور وہ ایسے موقعوں پر لا محالہ کہہ اٹھتیں:

"اگر وہ اتنی خوبصورت ہے کہ لوگ اس کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتے تو پھر ہم کیا کر سکتے ہیں۔"

"اندرونی شخصیت کا خوبصورت ہونا ظاہری حسن سے کہیں زیادہ ضروری ہے" میرے والد پُرزور لہجے میں کہتے۔

تاہم گاہے گاہے اس قسم کے خیالات کا اظہار کرنے کے باوجود وہ والدہ کو یہ بات نہ سمجھا سکے کہ میری صحیح تربیت کے لئے یہ ضروری ہے کہ غلطی کرنے پر مجھے سرزنش کی جائے۔ اس طرح میں نظم و ضبط اور پابندی کا احترام کرنا نہ سیکھ سکی بلکہ خاصی حد تک اپنی من مانی کرنے کی عادی ہو گئی۔

مجھے یاد ہے کہ ہماری سامنے والی گلی میں ایک لڑکا رہتا تھا۔ ہمارا ایک دوسرے کے ہاں بہت آنا جانا بھی تھا۔ ہم سارا دن اکٹھے کھیلتے تھے اور دن میں بیسیوں مرتبہ ایک دوسرے کے گھر چکر لگاتے۔ آپس میں بے تکلفی کا یہ عالم تھا

کہ اگر میں باورچی خانے میں جاکر یہ دیکھتی کہ والدہ کوئی ایسی چیز پکا رہی ہیں جو مجھے پسند نہیں تو میں دوسری گلی میں جا کر اس لڑکے کے ہاں کھانا کھا بیٹھتی۔ بلکہ بارہا ایسا بھی ہُوا کہ اپنے ہاں کھانا کھاتے میری نیت بدل جاتی اور چپکے سے کھسک جاتی اور جا کر دیکھتی کہ وہ لڑکا کیا کھا رہا ہے اور اگر اس کا کھانا مجھے اپنے گھر کے کھانے سے زیادہ لذیذ معلوم ہوتا تو میں اپنی بقیہ بھوک کی تسلی ان کے ہاں ہی کر بیٹھتی۔ مجھے یاد نہیں کہ ایسی نامعقول حرکت پر بھی میری والدہ نے کبھی مجھے گھُر کا یا دھمکایا ہو۔

لہٰذا میں نے جلد ہی یہ معلوم کر لیا کہ پورے ہمسائے میں میں جو جی چاہے کر سکتی ہوں۔ مثلاً اگر کسی دوست سے کسی معمولی بات پر میرا فضول جھگڑا ہو جاتا تو مجھے صرف والدہ کے سامنے اپنا دُکھڑا کہنے کی ضرورت تھی۔ وہ میرا قصہ سنتے ہی فوراً اُس ریچھنی کی طرح جو اپنے بچے کی حفاظت کے لئے مرنے مارنے پر تیار ہو اٹھ کھڑی ہوتیں۔ وہ میری آنکھوں میں آنسو دیکھنا گوارا نہ کر سکتی تھیں اور نہ اس امر کی برداشت کر سکتی تھیں کہ کوئی مجھے دُکھ یا رنج پہنچائے۔ لاتعداد مرتبہ ایسا ہُوا کہ وہ میرا ہاتھ تھامے مجھ سے جھگڑنے والوں کے ہاں جا پہنچتیں اور وہاں میرے حق میں تنازعے کا فیصلہ صادر فرماتیں۔

مجھے زیادہ یاد نہیں تاہم یہ بات قرین قیاس ہے کہ اس قسم کے خصوصی اور طرفدارانہ سلوک اور انتہائی پشت پناہی سے میری عادات خوب بگڑ گئی ہوں گی۔ تاہم ایک بات جو مجھے خوب یاد ہے وہ یہ ہے کہ میں اس کمسنی میں بھی اپنے والدین کو خوش کرنے کی خواہشمند

تھی اور اکثر ان کے بغیر کہے اپنے آپ ان کے لئے کچھ نہ کچھ کرنے کی کوشش کرتی۔ مثلاً جب میرے والد دن بھر کے کام کے بعد شام کو گھر آتے تو میں ان کی خدمت کرنے کی حتہ الوسیع کوشش کرتی۔ دراصل مجھے معلوم تھا کہ اب انہیں کس چیز کی ضرورت ہوگی کیونکہ گھر میں ان کی معمولات کا ہمیشہ ایک ہی انداز رہتا تھا۔ مثلاً وہ گھر میں داخل ہونے سے پہلے دہلیز پر رُک کر والدہ کو تسلیم کہتے جو اپنے سر کو کسی قدر جھکا کر انہیں گھر آنے پر "خوش آمدید" کہتیں اور بعد ازاں ان سے ان کا "بریف کیس" یا جو کچھ وہ ہاتھ میں لئے ہوتے ان سے لے لیتیں اور انہیں ان کے چپل پکڑا دیتیں تاکہ وہ جوتے اتار کر چپل پہن لیں اور گھر کے اندر داخل ہو سکیں۔ تب وہ کہتیں "غسل کا پانی تیار ہے یا کیا آپ پہلے کھانا تناول کرنا یا کچھ نوش کرنا چاہئیں گے؟"

والد کی آمد پر یہ کارروائی روز کا معمول تھی جس کے دوران میں قریب ہی خاموش اور منتظر کھڑی رہتی تھی۔ میں جانتی تھی کہ روزمرّہ کے اس معمول میں کسی کو مداخلت نہیں کرنی چاہیئے۔ اور اس اثنا میں میں اپنے گول مٹول ہاتھوں میں مضبوطی سے ایش ٹرے تھامے رکھتی جو کوزہ گری کی صنعت کی عمدہ مثال تھی۔ بعد ازاں میں یہ ایش ٹرے بڑی احتیاط سے ان کی طرف بڑھاتی تو اُن کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہو جاتی گویا کہہ رہے ہوں کہ مجھے اس بات کی بہت قدر ہے کہ تمہیں میرے آرام کا خیال ہے۔ اور اس دوران میں میری والدہ بھی آنکھوں ہی آنکھوں میں والد کی خدمت کی میری کوشش پر خوشی کا اظہار کرتیں۔

تب میرے والد چٹائی پر رکھے گاؤ تکیے کی طرف اشارہ کر کے کہتے مہربانی سے اُسے وہاں رکھ دو۔"

میں خوشی خوشی ایشن ٹرے وہاں رکھ دیتی اور والد کی آواز میں صرف لہجے کی نرمی سے جان جاتی کہ وہ مجھے پیار کرتے ہیں۔ لیکن میں اُن سے اِس سے زیادہ توجہ کی توقع نہ کرتی تھی کیونکہ یاد رہے کہ ہماری تہذیب صدیوں سے طور اطوار میں اِک خاص وقار کا پرچار کرتی آئی ہے۔ لہٰذا ایک مہذّب جاپانی صرف اطمینان اور سلامتی کے جذبات ہی کو منعکس کر سکتا ہے اور یہ بات میرے والد کے حق میں بالکل صحیح تھی جو تا حال قدیم جاپانی تہذیب کو خیرباد نہ کہہ سکے تھے۔ اور جن کا ایک پاؤں تو گویا ماضی میں اٹکا ہُوا تھا اور دوسرے کا نصف حصّہ زمانہ حال کی دہلیز پر ٹکا ہُوا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ میں نے آج تک اُنہیں یہ کہتے نہیں سنا کہ میں تمہیں عزیز رکھتا یا پیار کرتا ہوں اور نہ انہوں نے کبھی بچپن میں مجھے اپنی گود میں لے کر میرا مُنہ چُوما تھا کیونکہ جاپانی تہذیب کے مطابق جذبات کا ایسا مظاہرہ انہیں خاندان کی نگاہوں میں نیچا کر دیتا۔ غرض گھر میں اُن کی نشست و برخاست رفتار و گفتار اِک خاص رکھ رکھاؤ اور وقار کی حامل تھی۔ وہ عموماً کھانے سے پہلے چٹائی پر اُس گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر سگریٹ کے کش لگاتے جو اُن کے اِستعمال کے لئے مختص تھا اور خاندان میں ان کے اعلےٰ مقام یعنی سربراہی کا اعلان کرتا تھا۔ ان کے والد کو بھی اپنے گھر میں یہی عزّت و مرتبت حاصِل تھی جو اب میرے والد کے

حصّے آئی تھی اور جو بعد ازاں اُن کے بیٹوں کو اپنے اپنے جداگانہ خاندانوں میں حاصِل ہونے کو تھی۔

جب شام کا کھانا تیار ہو جاتا جس کا مطلب یہ ہے کہ جب والد کہتے کہ وہ کھانا کھانے کے لئے تیار ہیں تو ہم ایک پست میز کے گرد بیٹھ جاتے اور یہاں پر ہماری بیٹھنے کی ترتیب ہمیشہ ایک ہی ہوتی جس میں کبھی کوئی تبدیلی رونما نہ ہوتی۔ یعنی میرے والد میز کے ایک سرے پر خاص تعظیم کی جگہ پر تشریف رکھتے اور والدہ باورچی خانے کے نزدیک میز کے عین دوسرے سرے پر۔ بڑا بھائی والد کے نزدیک ہوتا کیونکہ پہلوٹھا اور بڑا بیٹا ہونے کی وجہ سے اُسے خاندان میں خاص مقام حاصِل تھا۔ اس کے بعد چھوٹا بھائی اور اس کے بعد یورِیکو اور میں۔ دراصل لڑکیاں ہونے کی وجہ سے خاندان میں مرتبت کے لحاظ سے ہماری کوئی خاص وقعت نہ تھی۔

خیر کھانا کھاتے وقت مچھلی والے دِن مجھے مشکل کا سامنا کرنا پڑتا۔ کیونکہ مجھے اِس میں سے کانٹے نکالنا بہت دشوار معلوم ہوتا تھا اور غالباً اِسی لئے مجھے مچھلی زیادہ پسند نہیں تھی، اور نہ زیادہ مرتبہ مچھلی پکائی جاتی۔ لیکن جب ایسا ہوتا تو جب والدہ میری پلیٹ میں مچھلی کا قتلہ رکھتیں تو میں اپنی پلیٹ والد کے سامنے رکھ کر کہتی:

"مہربانی سے اِس میں سے کانٹے نکال دیں۔"

وہ میری پلیٹ لے کر مچھلی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرتے

اور اس میں سے سارے کانٹے نکال کر علیحدہ کر دیتے۔ ایک دن جب میں اپنی پلیٹ اُن کے سامنے رکھ کر بے صبری سے اِنتظار کر رہی تھی کہ کب کانٹے نکالیں اور کب مَیں کھانا کھانا شروع کروں تو چھوٹا بھائی جو ابھی ہائی سکول میں تھا بولا:

"یونیکو کیا بات ہے؟ کیا تمہیں یہ فکر لگی ہے کہ والد صاحب تمہارے حصّے کی مچھلی کھا جائیں گے؟"

مجھے اُس وقت وہ بھی والد کی طرح بڑا اور دانا اور اہم معلوم ہوتا تھا۔ تاہم مَیں اس کے چھیڑنے کو نظر انداز کر دیتی کیونکہ مَیں دو بڑے بھائیوں کی وجہ سے اب چھیڑ چھاڑ کی عادی ہو گئی تھی۔

"کیا آپ نے سارے کانٹے نکال دیئے ہیں"۔ مَیں نے ہمیشہ کی طرح احتیاطاً سوال کیا۔

"ہاں سب کے سب۔ تمہارے گلے میں کانٹا چبھنے کا کوئی خطرہ نہیں"۔

"کیا آپ نے چھوٹے کانٹے بھی نکال دیئے ہیں"؟

"ہاں چھوٹے والے بھی"۔

اس پر یوریکو بولی:

"یونیکو کی شادی نہیں ہو سکتی۔ اُسے والد صاحب کے ساتھ ہی رہنا پڑے گا تاکہ وہ اسے مچھلی میں کانٹے نکال کر دے سکیں"۔

"ممکن ہے والد اس کے خاوند کو اس کے حصّے کی مچھلی میں سے کانٹے نکالنا سکھا دیں"۔

بڑے بھائی نے اپنی رائے دی۔

جب میری شادی ہوگی تو میں سرے سے مچھلی ہی نہیں کھاؤں گی۔"

"تمہیں مچھلی کھانی پڑے گی کیونکہ والد ایک ماہی گیر کے لڑکے سے تمہاری شادی کرنے کا انتظام کر رہے ہیں۔" چھوٹے بھائی نے چھیڑتے ہوئے کہا۔

اِس پر میری گالیں غصّے سے ٹمٹما اُٹھیں اور میں پُرزور لہجے میں بولی:

"میں اپنی شادی اپنی مرضی سے کروں گی۔"

اِس پر میری والدہ کی نگاہیں غصّہ برسانے لگیں لیکن یہ غصّہ انہیں مجھ پر نہیں بلکہ چھوٹے بھائی پر تھا۔ تاہم انہوں نے منہ سے کچھ نہ کہا کیونکہ والد کی موجودگی میں کسی بات پر بچوں کی روک ٹوک کرنا والد کی ذمہ داری تھی والدہ کی نہیں۔ مگر والد صاحب نے بھی چپ چاپ پلیٹ مجھے پکڑا دی اور یوں ظاہر کیا گویا انہوں نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔

دُوسرا باب

اِس میں شک نہیں کہ میرے والد مجھے پیار کرتے تھے اور میں اُنہیں۔ لیکن ہمارے درمیان وہ قربت اور بے تکلفی موجود نہ تھی جو والدہ اور میرے درمیان تھی۔ اوّل تو میں اپنے والد کو ایسی ہستی کی حیثیت سے جانتی تھی جو اپنا بیشتر وقت گھر سے باہر گذارے کیونکہ وہ صبح سویرے میرے بیدار ہونے سے پہلے ہی گھر سے کام پر روانہ ہو جاتے اور میرا اسکول ختم ہونے کے خاصی دیر بعد شام کو گھر واپس آتے تھے۔ علاوہ ازیں وہ شاذ و نادر ہی مجھ سے بات کرتے تھے اور اگر کبھی ایسا اتفاق ہوتا کہ وہ مجھ سے بات کریں تو وہ اپنی باتوں سے میرے سکول یا میری سہیلیوں میں کسی دلچسپی کا اظہار نہ کرتے تھے۔ تاہم مجھے اِس سے ذرہ بھر پریشانی نہ تھی کیونکہ میرے والد بھی اپنے والد کی مانند بیشتر جاپانی مردوں کی طرح کم گو تھے، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ خاندان میں میرے بھائیوں کے علاوہ کسی دوسرے سے زیادہ دیر تک لمبی چوڑی گفتگو نہ کرتے تھے۔

بڑا بھائی پہلوٹھا بیٹا ہونے کے باعث خاندان میں ایک خاص مقام رکھتا تھا اِس لئے میرے والد اُسی کو اپنی توجہ کا مرکز بناتے تھے۔ بڑا بھائی پڑھائی میں بہت اچھا تھا اور اس کی بڑی خواہش

تھی کہ وہ ہائی سکول سے فارغ ہو کر اعلےٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے کالج میں داخلہ لے۔ مگر والد اس خیال کے سراسر خلاف تھے، اور جہاں تک مجھے یاد ہے کہ یہی ایک بات تھی جس پر ہمارے گھر کی بالعموم خوش باش زندگی میں فرق پڑ جاتا تھا اور وقتی طور پر رنجش کی لہر دوڑ جاتی۔ اس کے متعلق خاصی بحث و تکرار ہوا کرتی تھی۔

میں تب بہت چھوٹی تھی اور یہ نہیں جانتی تھی کہ کس بات پر بحث ہو رہی ہے لیکن اس کمسنی میں بھی خاندان کے افراد کے چہروں کے تاثرات پڑھنا سیکھ چکی تھی۔ بعد ازاں مجھے معلوم ہوا کہ والد نہ صرف اپنی دھن کے پکے بلکہ خاصی حد تک ضدی بھی واقع ہوئے تھے اور بعض معاملات میں بڑی ہٹ دھرمی سے کام لیتے تھے۔ لیکن پانچ سال کی عمر میں میں یہ سب کچھ نہ سمجھ سکتی تھی۔ اس وقت صرف اتنا جان لیتی تھی کہ والد اور بڑا بھائی دونوں ہی بہت پریشان ہیں۔ دراصل بڑے بھائی کے سر پر اُن دنوں کالج جانے کی دھن سوار تھی، اور وہ اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح والد کو اس بات پر آمادہ کر سکے لیکن کالج کا ذکر سنتے ہی والد کو غصہ آجاتا۔ یہ بات چیت عام طور پر کچھ اس نہج پر ہوا کرتی تھی:

"میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اگلے سال کالج چلا جاؤں" بڑا بھائی حسرت بھرے لہجے میں کہتا۔

اتنا سنتے ہی والد کا دبلا پتلا جسم کپکپا اُٹھتا۔ وہ کہہ اُٹھتے۔

"میں جانتا ہوں تم کیا چاہتے ہو۔ تم چاہتے ہو کہ میں تمہارے

کالج کے اخراجات برداشت کروں لیکن میں ایسی حماقت کے لئے پھوٹی کوڑی تک نہ دوں گا۔"

"میں کالج جانے کا فیصلہ کر چکا ہوں اور یہ آپ کی مدد کے بغیر بھی ہو سکتا ہے۔"

"تم فیصلہ کر ہی چکے ہو تو جاؤ۔ لیکن یاد رکھو کہ مجھ سے مالی مدد کی اُمید عبث ہو گی۔"

"تو پھر میں خود ہی اس کا انتظام کر لونگا۔"

اور یہ کہتے ہوئے بڑے بھائی کا چہرہ مُردہ مچھلی کی طرح بد رنگ ہو جاتا۔

عموماً یہاں تک پہنچ کر بات ختم ہو جایا کرتی لیکن اب کی مرتبہ منجھلا بھائی جو جلد غصے میں آجایا کرتا تھا بول اٹھا:

"والد صاحب! آپ بھیّا کی بات مان کیوں نہیں لیتے! ہر کوئی جانتا ہے کہ اس زمانے میں ترقی کرنے کے لئے تعلیم اشد ضروری ہے۔"

"یہ تو تمہارا اپنا خیال ہے۔"

والد اس قسم کا چیلنج قبول کرنے پر تیار رہتے تھے خواہ یہ ان کے زود رنج بیٹے ہی سے کیوں نہ ہو۔

"یہ ہر ایک کا خیال ہے۔"

اس پر والد کی آنکھیں غصّے سے چمک اُٹھیں اور میں ڈر کر والدہ کے پیچھے چھُپ گئی۔ یہ سب باتیں مجھے خاصہ پریشان کر دیتی تھیں۔

خیر میرے والد جلد ہی اپنی آواز پر قابو پا کر اطمینان سے بولے:

"وہ لوگ جو ایسی باتیں کرتے ہیں خود انجان ہیں۔ میں تو ایک بات جانتا ہوں کہ دنیا میں ترقی کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ محنت کرو اور دیانتداری سے کام لو۔ محنت اور دیانت وہ ایسی خوبیاں ہیں جن سے انسان دوسروں کا اعتماد حاصل کر سکتا ہے اور یہ ایک ایسی چیز ہے جس سے کامیابی اور خوشی حاصل ہوتی ہے۔ محنت اور دیانت کی صفات کی وجہ سے لوگ تمہاری عزت کرینگے اور دوسروں پر تمہیں ترجیح دیں گے۔ اگر تم دونوں ان دو خاصیتوں کو اپنا لو تو تمہیں کالج میں اپنا وقت اور پیسہ ضائع کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم اس کے بغیر ہی کامیاب زندگی بسر کر سکتے ہو۔"

"ہم یہ سب باتیں تب سے سن رہے ہیں جب ہم یونیکو سے بھی چھوٹے تھے اور اب بھی جب کبھی کالج کا نام لو یہی سنتے ہیں۔"

"ہاں میں مانتا ہوں کہ میں نے یہ باتیں پہلے بھی کہی ہیں لیکن تم ہو کہ سنتے ہی نہیں۔ گویا تم نے اپنے کانوں میں روئی ٹھونس رکھی ہے۔ میاں میں پھر کہتا ہوں میری بات مانو اور کالج جانے کی رٹ نہ لگاؤ۔ یہ سراسر حماقت ہے۔ اس کو بھول جاؤ۔ میرے نقش قدم پر چلو۔ تمہارے لئے اچھا ہوگا۔ دنیا میں ترقی کرنے کا یہی واحد ذریعہ ہے۔"

اس پر میرے بھائی ایک دوسرے کا مُنہ تکنے لگے۔ اُن کا رنگ فق تھا اور بھینچے ہوئے ہونٹ غصّے سے کپکپا رہے تھے۔ کالج اور وہاں کے اخراجات پر بات چیت کا ہمیشہ یہی انجام ہُوا کرتا تھا۔ غصّے کی شدت کی وجہ سے ان کی زبان پر گویا تالہ پڑ گیا تھا۔

میرے والد غالباً بدمزگی ختم کرنے کو اُٹھ کر باہر کہیں چلے گئے اور کچھ دیر بعد میں دونوں بڑے بھائیوں کو دوبارہ اُسی موضوع پر گرما گرم بحث کرتے سنا تو میں خوف کے مارے کانپ اُٹھی کہ کہیں والد واپس آ کر یہ نہ سُن لیں۔ لیکن منجھلا بھائی اپنی کڑکڑاتی آواز میں بلاخوف طنز بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا:

"وہ ہمیں اپنی تابندہ مثال کی پیروی کرنے کی تلقین کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم بھی ان کی طرح کامیاب ہوں گے۔ میں ان جیسی کامیابی سے باز آیا۔ اُن کی کامیابی! کیا کہنے! شہر کے کوڑہ کرکٹ کو ٹھکانے لگانے والے محکمہ کے دفتر میں کلرکی۔ کیا یہ ایک ایسا رتبہ ہے جس پر ناز کیا جا سکے"؟!

بڑا بھائی جس کے نظریات والد کے لئے ہمدردانہ رویّے کے حامل تھے بولا:

"خواہ کچھ بھی ہو اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے اپنی ملازمت اور اپنے فارم (کھیت) دونوں ہی میں محنتِ شاقہ سے کام لیا ہے اور ہمیشہ دیانتداری کو اپنایا ہے۔ دیگر انہوں نے کفایت سے کام لے کر بہت سے پیسے جمع کئے ہیں۔ تو کیا یہ فخر

کرنے کی بات نہیں ؟"

"پیسے جمع کئے ہیں تو رونا کاہے کا ہے ؟ پھر تو وہ آسانی سے تمہاری مدد کر سکتے ہیں ۔"

اب میرے بڑے بھائی کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ والد کے خلاف اس قدر کڑوے کسیلے لہجے میں مزید باتیں نہیں سن سکتا۔ وہ خود منجھلے بھائی کی طرح جلد طبیعت میں آنے والا نہیں تھا۔ لہٰذا وہ بولا :

"میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اگلے سال کالج تو میں جا رہا ہوں مگر تم اس قدر پیچ و تاب کیوں کھا رہے ہو ؟"

"اس لئے کہ تم اُن کے پہلوٹھے ہو اور اگر کالج کے اخراجات برداشت کرنے میں وہ تمہاری مدد نہیں کر سکتے تو میں جو اُنکا چھوٹا بیٹا ہوں میری مدد کہاں کریں گے" ؟ منجھلے بھائی نے برجستہ جواب دیا اور ایسا کرتے ہوئے اس کے لہجے میں تلخی اور حسد کی نمایاں جھلک موجود تھی۔

"خیر وہ میری تعلیم پر مزید خرچ نہ کرنے کا عزم کر چکے ہیں لہٰذا اس موضوع پر اور زیادہ بات چیت بیکار اور بے سود ہے ۔"

"جواب آنجناب خود یہ فرمائیے ہیں۔ میاں اگر وہ ارادہ کر چکے ہیں تو ارادہ بدل بھی سکتے ہیں۔ یہ کوئی پتھر پر لکیر نہیں کہ مٹائی نہیں جا سکتی ۔"

غرض اس موضوع پر اسی طرح ماضی میں اور اب بھی کئی مرتبہ بحث ہوئی لیکن اس کا نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات رہا۔ اور جب

میرے بڑے بھائی کے کالج جانے کا وقت آیا تو اُسے محنت مزدوری کرکے خود ہی اپنے اخراجات کے لئے پیسے کمانے پڑے۔ والد بدستور اپنے فیصلے پر ڈٹے رہے اور انہوں نے اپنے قول کے مطابق اس کی کوئی مدد نہ کی۔ بلکہ منجھلے بھائی کی تمام تر حاضر جوابی اور برہم مزاجی بھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ پیدا کر سکی اور وقت آنے پر اُسے بھی کالج جانے کے لئے خود ہی روپے پیسے کا بندوبست کرنا پڑا۔

خیر جہاں تک میری ننھی منی دنیا کا تعلق تھا وہاں اُس وقت اِن مسائل کو کوئی اہمیت حاصل نہ تھی۔ گاہے گاہے گھر میں بحث و تکرار سننے کی میں عادی ہو چکی تھی اور اُسے بھی ایسی بے فکری سے سُن لیتی تھی جس طرح کھیت میں شہتوت پر بیٹھی چڑیوں کی چہچہاہٹ کو۔ میرے بچپن کی یہ دنیا ایک ایسی دنیا تھی جس کا مرکز و محور میری ماں کی ہستی تھی۔ ہم دونوں میں وابستگی کا یہ عالم تھا کہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ہماری زندگیاں ایک دوسرے میں ملفوف اور لپٹی ہوئی تھیں اور ہم دونوں اس طرح نہایت ہی مطمئن اور مسرور تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہم دونوں ایک دوسرے کیلئے خاص اہمیت کے حامل تھے، یعنی والدہ مجھ پر اپنی جان چھڑکتی تھیں اور میں اُن کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔ مجھے ابھی تک ان کے مضبوط ہاتھ کی سکون بخش گرفت یاد ہے جب وہ میرا ننھا ہاتھ تھامے ریلوے سٹیشن کی طرف جا رہی ہوتی تھیں کہ وہاں سے بذریعہ ریل گاڑی اس گاؤں جاتیں جہاں ہم شہر میں آنے سے پہلے رہتے تھے۔ میں اسی گاؤں میں پیدا ہوئی تھی۔ لیکن جب والد کو شہر

میں ملازمت مل گئی تو ہمیں فارم والے گھر کو خیرباد کہنا پڑا اور ہم اس شہر میں آن بسے۔ اُس وقت میری عمر تین سال کی تھی۔

یہی وجہ ہے کہ مجھے فارم پر اپنی پہلی اور مستقل رہائش کے متعلق واضح طور پر کچھ یاد نہیں۔ تاہم اس فارم سے میرے بچپن کی کئی یادیں وابستہ ہیں کیونکہ ہم شہر سے اکثر گاؤں جایا کرتے تھے۔ چند سال ہوئے میں نے وہاں جاکر پھر سے وہ گھر دیکھا مگر اب کی مرتبہ وہ مجھے کسی قدر تنگ و تاریک سا معلوم ہُوا جبکہ بچپن میں وہ مجھے ہمالہ پہاڑ کی طرح وسیع اور بلند نظر آتا تھا۔

میں زیادہ تر اپنی والدہ کے ساتھ ہی فارم پر جایا کرتی تھی تاہم گاہے گاہے مجھے والد کے ساتھ بھی وہاں جانے کا موقع ملا۔ وہ ہفتہ بھر اپنی باقاعدہ ملازمت پر حاضر ہوتے لیکن سنیچر کو انہیں آدھے دن کی چھٹی ہوتی تھی، اور چونکہ اتوار کا دن بھی چھٹی کا دن ہوتا لہٰذا وہ کوشش کرتے کہ ہفتہ کی شام کو ہی وہاں پہنچ جائیں۔ جب میں اُن کے ہمراہ ہوتی تو وہ مجھے اپنی بائیسکل کے پیچھے بٹھا لیتے اور ہفتہ کی شام ہی کو فارم پر پہنچ جاتے۔ یہاں آکر وہ ہل چلاتے یا کھیت سے فالتو جڑی بوٹیاں اکھاڑتے اور اگر کٹائی کا وقت ہوتا تو فصل کاٹتے۔ اس کے علاوہ وہ ریشم کے کیڑوں کی دیکھ بھال کرتے۔ مجھے یاد ہے کہ میری والدہ ہر سال ریشم کے کیڑوں میں سے کچھ کیڑے بچا کر رکھ لیتی تھیں جن سے وہ بعد ازاں دھاگا تیار کر کے ریشمی کپڑا تیار کرتیں اور پھر اپنے ہاتھ سے پورے خاندان کے لئے کمونے[1] تیار کرتیں۔ میری

---

[1] ایک قسم کا لبادہ جو جاپانی عورتیں لباس کے اوپر پہنتی ہیں۔

والدہ دیگر بعض عورتوں کی طرح کسی دکان یا کارخانے میں کام نہیں کرتی تھیں بلکہ اپنے خاندان کی دیکھ بھال میں ہم وقت مصروف رہتی تھیں۔ تاہم گھریلو کاموں میں سے ان کا کوئی اور کام اس قدر عمدہ اور قابلِ تحسین نہیں تھا جس قدر اُن کے تیار کردہ خوبصورت ریشمی کمونے۔ میرے والد اکثر ان کے بنائے ہُوئے کمونے کو ہاتھ میں پکڑ کر اسکے عمدہ اور خوشنما کپڑے پر پیار سے ہاتھ پھیرتے اور کہہ اُٹھتے :

"بہت عمدہ ..... نہایت ہی نفیس"

اور میرا خیال ہے کہ یہ الفاظ نہ صرف کپڑے کی تعریف کرتے بلکہ میری ماں پر یہ ظاہر کر دیتے کہ والد کے دل میں ان کیلئے محبت اور ان کی خدمات کے لئے بڑی قدر ہے۔

ہاں تو فارم کا ذکر ہو رہا تھا جہاں والد خوب مصروف وقت گذارتے تھے لیکن میرے لئے یہ ایّام فقط خوش وقتی کے لئے وقف تھے اور نہایت ہی پُر لطف بلکہ ولولہ خیز ہوتے۔ کیونکہ اوّل تو شہر میں چپّہ بھر زمین پر بنے ہوئے گھر کے مقابلے میں یہ جگہ مجھے بہت وسیع اور کشادہ معلوم ہوتی تھی، پھر یہاں مجھے سب جگہ گھومنے پھرنے کی اجازت تھی اور مَیں اس سے خوب فائدہ اٹھاتی اور شہتوت کھاتے ہوئے ہر جگہ اٹھلاتی پھرتی۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا گویا اِس گھر کے کشادہ کمرے مجھے اپنے اندر آنے کے لئے اشارے کر رہے ہوں اور مَیں اپنی چھوٹی چھوٹی ٹانگوں پر ایک کمرے سے دوسرے میں گھومتی پھرتی اور شام ہونے تک تھکان سے چور ہو جایا کرتی۔

والدہ کے ساتھ فارم پر جانا میرے لئے اس سے بھی زیادہ ولولہ خیز ہوتا تھا کیونکہ اکثر ہم واپسی پر اُن کی کسی نہ کسی سہیلی کے ہاں ملاقات کرنے بھی جایا کرتے تھے۔ اور میں بہت خوش ہوتی تھی کہ وہ مجھے ہمیشہ ساتھ لاتی تھیں اور اس وقت بھی مجھے گھر پر نہیں چھوڑتی تھیں جب یوریکو گھر پر میری دیکھ بھال کر سکتی تھی۔ پھر ہم راستے میں آباد اجداد کی قبروں کے نزدیک مندر میں جایا کرتے تاکہ وہاں جا کر انہیں ہدیۂ عقیدت پیش کریں۔

بیشتر خاندانوں میں عموماً باپ سب سے زیادہ دیندار ہُوا کرتا ہے۔ کیونکہ خاندان کا سربراہ ہونے کی وجہ سے یہ اسکی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے خاندان کے لئے معبد کا انتظام کرے جہاں اُس کے مرحوم آباد اجداد کی رُوحوں کی پرستش کا معقول بندوبست ہو۔ میرے والد چونکہ اپنے خاندان میں دوسرے نمبر پر تھے لہٰذا وہ اپنے باپ کے کاروبار کے وارث نہ بنے نہ ان کے حصّہ یہ ذمہ داری آئی کہ وہ اپنے آباد اجداد کی روحوں کی پرستش کے سلسلہ کو جاری رکھیں۔ کیونکہ دستور کے مطابق سب سے بڑا بیٹا ہی باپ کی زیادہ تر ملکیت کا وارث ہوتا ہے اور اُسی پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے خاندان کے مرحوم بزرگوں کی پرستش کو جاری رکھے۔

اسی لئے جاپان میں اُس وقت (اور بعض خاندانوں میں تاحال) یہ رسم رائج تھی کہ اگر کوئی جوڑا بے اولاد ہو تو وہ کسی دوست یا رشتہ دار کا تندرست اور جوان بیٹا لے پالک بنا لے

تاکہ اس طرح ان کے خاندان کے آبا و اجداد کی روحوں کی پوجا پاٹ کا سلسلہ قائم رہ سکے۔ میرے والد کو بھی ایسا متبنّٰی بننے کا اتفاق ہُوا۔ یعنی اپنے اصلی خاندان میں دوسرا بیٹا ہونے کی وجہ سے وہ اس دینی ذمہ داری سے سبکدوش تھے مگر ایک دوسرے خاندان کا لے پالک بیٹا ہونے کی وجہ سے ان کے کندھوں پر یہ ذمہ داری آن پڑی۔ ویسے وہ متبنہ بننے کے بعد بھی پہلے کی طرح اپنے والدین کے ساتھ ہی بدستور بود و باش کرتے رہے مگر جب ان کے مُنہ بولے والدین وفات پا گئے تو معاہدہ کے مطابق اُن کا فارم میرے والد کی ملکیت بن گیا جس کے بدلے وہ بڑی وفاداری سے خاندانی معبد میں جاکر اس خاندان کے بزرگوں کی روحوں کی پرستش کا فریضہ انجام دیتے رہے۔

ویسے سچ پوچھئے تو وہ اس پرستش کے دل سے قائل نہ تھے، اور صاف صاف ہم سب سے کہتے تھے کہ میں عبادت کی رسوم کو اس لئے ادا کرتا ہوں کہ میں نے اس وقت ایسا کرنے کا عہد کیا تھا جس کے بدلے میں اُن لوگوں نے مجھے اس فارم کا عطیہ دیا ہے۔ لہٰذا وہ عبادات میں ذاتی اعتقاد نہ ہونے کے باوجود نہایت دیانتداری اور وفاداری سے اپنا وعدہ وفا کرتے رہے۔

دراصل میرے والد بغیر دیکھے ایمان لانے کے قائل نہ تھے۔ وہ ایسے شخص تھے جو کسی چیز کو چھُو، ٹٹول بلکہ ٹھوک بجا

کراس کے اصلی ہونے کا تیقّن کرنے کے بعد ہی اُس پر اعتبار کرتے تھے اور یہی اصول وہ مذہب کے سلسلے میں بھی استعمال کرنا چاہتے تھے۔ وہ سخت محنت، دیانتدارانہ لین دین اور کفایت جیسے اصولوں کی افادیت کو سمجھتے تھے اور ذاتی تجربے سے اُن کی اہمیّت کے قائل تھے اور اِس امر کے معتقد تھے کہ مذکورہ بالا صفات اِنسان کو سرخروئی اور کامیابی سے ہمکنار کر سکتی ہیں۔ لہٰذا ایسے زریں اصولوں کے پیشِ نظر وہ مذہب کے متعلق سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کرتے تھے جو انہیں توہمات کی کئی موٹی تہوں میں لپٹا ہُوا معلوم ہوتا تھا اور بقول انکے کسی کے لئے کسی عملی افادیت کا حامل نہ تھا۔

ان کی دانست میں دین ضعیف کی لاٹھی اور کمزور کا سہارا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ ممکن ہے عورت جو کمزور نفس اور کمزور ظرف واقع ہوئی ہے اس کو مندر میں جانے سے کچھ حاصل ہوتا ہو یا وہ بچّہ جو خود اپنی حفاظت نہ کر سکتا ہو اُسے کچھ ڈھارس پہنچتی ہو یا ایسا آدمی جو اپنی زندگی کے آخری ایام سخت تکلیف میں بسر کر رہا ہو مذہب اس کے لئے کوئی تسلی و تشفی مہیّا کرتا ہو لیکن وہ شخص جو مضبوط و تنومند ہو اور بخوبی اپنی حفاظت کر سکتا ہو مذہب اس کی مدد و معاونت کرنے کی بجائے اُلٹا اس کی راہ میں رکاوٹ بن جائے گا۔

لیکن میری والدہ واقعی دیندار تھیں۔ انہیں مذہب سے دلی عقیدت تھی۔ وہی اظہارِ عقیدت میں خاندانی معبد کی گھنٹی

بجایا کرتیں۔ وہی گھر سے باہر بڑے مندر میں جایا کرتی تھیں۔ ویسے اتنا ضرور ہے کہ والد صاحب ان کے ایسا کرنے پر کبھی ناک بھوں نہ چڑھاتے اور نہ وہ اس بات پر برا مانتے کہ بہت سے پروہتوں کے ساتھ اُن کے خوشگوار مراسم ہیں۔ بقول اُن کے، انکے پاس خود تو ایسی حماقت کے لئے کوئی وقت نہ تھا اور وہ خوش اور مطمئن تھے کہ ان کی بجائے والدہ ان کی ذمہ داری سے بخوشی اور بخوبی عہدہ برآ ہو سکتی ہیں۔

جیسا کہ پیشتر ازیں ذکر کیا گیا ہے کہ والدہ اور میں فارم جاتے ہوئے راستے میں ایک مندر پر عبادتی رسومات ادا کرنے کے لئے ٹھہرا کرتے تھے۔ یہ مندر ہمارے آباؤ اجداد کے قبرستان کے نزدیک ہی تھا۔ مندر میں حاضری دینے کے بعد میری والدہ اور میں جھاڑیوں اور اونٹ کٹاروں میں سے گذر کر اس پگڈنڈی پر ہو لیتے جو قبرستان کی طرف لے جاتی تھی جہاں پہنچ کر ہم اپنے بزرگوں کی قبروں کے پاس تعظیماً چپ چاپ کھڑے رہتے۔ مندر میں پرستش کے بعد ہم بلاناغہ ایسا کرتے تھے۔

اور اس کے بعد ہم عموماً کسی خاندان سے ملاقات کرنے جاتے اور ان کے لئے اپنے ہمراہ مالٹے یا موسم کا کوئی پھل تحفے کے طور پر لے جاتے جو اچھے حسب نسب کی علامت ہے۔ یہ ایسا دستور ہے جس کے سب جاپانی پابند ہوتے ہیں۔ میری والدہ کہا کرتی تھیں کہ "لوگوں کی ملاقات کے لئے جاتے ہوئے ہمیں ہمیشہ انکے لئے کوئی تحفہ لے جانا چاہیئے"، وہ اس لئے یہ بات ہمیشہ کہتی

تھیں کہ میں اس اصول کو ذہن نشین کر لوں تاکہ بڑا ہونے پر اس اصول پر عمل کر سکوں۔

ویسے اب تک میں ملاقات کے معمول کو خوب جان گئی تھی۔ جب ہم کسی کے ہاں جاتے تو سب سے پہلے لمبے چوڑے سلام و آداب کے منازل طے ہوتے۔ اس کے بعد گھر کی مالکہ کسر نفسی سے اپنی کم مائگی کا اظہار کرتیں۔ مثلاً

"ہم کس قابل ہیں کہ آپ ہمیں اپنی توجہ کے لائق سمجھیں اور ہمارے ہاں تشریف لانے کی زحمت کریں" وغیرہ وغیرہ

اور اس کے بعد ہمیں اندر آنے کی دعوت دیتیں۔ تب خاتونِ خانہ ہمارے پیش کردہ تحفے کو خاندانی معبد میں لے جا کر گویا اپنے بزرگ رفتگاں کی روحوں کے حضور نذر کرتیں۔ اس کے بعد وہ تحفہ وہاں سے اٹھا لیا جاتا اور بالآخر افرادِ خانہ کے استعمال میں لایا جاتا۔

ویسے میں نے کمسنی ہی میں اس امر کو پہچان لیا تھا کہ مندر میں پرستش اور عبادت کرنا، دوستوں یا رشتہ داروں کو تحائف دینے سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ کم از کم والدہ اس کو بہت اہمیت دیتی تھیں۔ وہ مندر جاتے ہوئے ہر دفعہ مجھ سے کہتیں:

"کیا تم نے کبھی سوچا ہے کہ ہم کس قدر خوش قسمت ہیں "جوٹنزی کیو" کے مندر کے اس قدر قریب رہتے ہیں ورنہ ہمیں ہمیشہ گھر کے قریب چھوٹے معبد میں عبادت کرنی پڑتی۔ یہاں پر پروہت ہیں جو ہماری

بنیہ اور دیوی کے متعلق سب کچھ جانتے ہیں کہ کس طرح اُسے روپا بخشی گئی اور بہت سے بھیدوں کو اس پر ظاہر کر دیا گیا۔ یونیکو دیوتا اسکے اندر بستے تھے اور انہوں نے اسے بہت سے قدرت والے کام کرنے پر مقرر کیا۔ میرا خیال ہے کہ پروہتوں کے قدموں میں بیٹھ کر دیوی کی فہم و فراست اور دیوتاؤں کی طاقت اور قدرت کا بیان سننے سے زیادہ خوش آئند کام کوئی نہیں۔ میں پہروں بیٹھی پروہتوں کی ایسی باتیں سُن سکتی ہوں۔"

بیشک میں اُس وقت اس قابل نہ تھی کہ والدہ کی ساری باتوں کو بآسانی سمجھ سکوں، تاہم میں دیوتاؤں کی قدرت سے متاثر ضرور ہوتی تھی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میں اُن کی طاقت کا ذکر سُن کر سہم سی جاتی تھی۔ انہوں نے کئی بار مجھ سے یہ کہا تھا کہ "مذہب ہی ایسی طاقت ہے جس کے بل بوتے پر لوگ مستقبل میں پیش آنے والے حالات کی پہلے سے خبر دے سکتے ہیں، اور بارہا پروہتوں نے پیش آنے والے واقعات سے انہیں پہلے ہی سے آگاہ کیا ہے۔"

نیز اُن کا کہنا تھا کہ "بہت مرتبہ میں نے ڈاکٹر کے مشورے اور اُس کی دوائی کے بغیر ہی اپنے مرض سے شفا پائی ہے۔"

اِن ساری باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ مذہب اُنکے لئے بہت اہمیت رکھتا تھا بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ دین پر اعتقاد ایمان میری ماں کی جان تھا۔

تیسرا باب

مجھے یہ علم نہیں کہ میری والدہ "ٹنری کیو" کے اُس عقیدے کی طرف کب اور کس طرح مائل ہوئیں جو بُدھ مت کے شنٹو فرقے سے تعلق رکھتا ہے اور جاپان کے اُس حصّے میں جہاں ہم رہتے تھے، خاصہ مقبول ہے! صرف اِتنا یاد ہے کہ ہم جھاڑیوں اور اونٹ کٹاروں سے پہلو بچاتے ہوئے پہلے اپنے بزرگوں کی قبروں پر جایا کرتے تھے اور اس کے بعد اس فرقے کے مندر میں باقاعدگی سے حاضری دیتے تھے جہاں ڈھونک کی ڈھم ڈھم اور گھنٹوں کی ٹن ٹن عبادت کا اہم جزو تھیں اور جہاں دعائیں ایک خاص راگ میں الاپی جاتی تھیں۔

بیشک بیشتر جاپانی مذہبی فرائض ادا کرنے میں لاپرواہ تھے لیکن میری والدہ مذہب کی بے حد پابند تھیں اور اپنے علم کے مطابق عبادت کی ہر رسم کو نہایت عقیدت اور وفاداری سے پورا کرتی تھیں۔ علاوہ ازیں وہ بہت سخی اور فیاض تھیں اور اُن کی یہ فیاضی جنگ کے ان سالوں میں بھی بدستور قائم رہی جبکہ ملک میں ہر شے کی قلّت تھی، اور اس طرح اس مندر کے سارے پروہت اور پجاری میری والدہ کے قریبی دوست

بن گئے تھے۔ وہ ہمیں اپنے ہاں آنے کی دعوت دیتے اور ہم دونوں فارم پر بنے ہوئے قدیم طرز کے آتشدان کے گرد بیٹھ جاتے۔ یہ آتشدان فرش کے اندر بنا ہُوا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ جب موسم خاصہ گرم ہوتا تو بھی وہاں تمام دن آگ جلتی رہتی۔ مَیں نگاہ اُٹھا کر اس چھت کو دیکھتی جو دھوئیں سے سیاہ ہو چکا تھا۔ لیکن اِس کمرے پر جو مجھے سمندر کی طرح وسیع دکھائی دیتا تھا کوئی پکی چھت نہ تھی۔

مجھے یاد ہے کہ چند مرتبہ جانے کے بعد جب مَیں اُس جگہ سے کسی قدر مانوس ہو گئی اور میری جھجک ذرا کم ہوئی تو مَیں اُن ستونوں کے گرد کھیلا کرتی تھی جو چھت کو تھامنے کے لئے نصب کئے گئے تھے۔ مجھے درمیان والا بڑا ستون خاص طور پر پسند تھا۔

"یونیکو کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہ بڑا ستون کس بات کی علامت ہے"؟

مہربان پروہت نے ایک مرتبہ مجھ سے سوال کیا۔

"یہ تمہارے والد کی طاقت کی علامت ہے، اس طاقت یا پیسے کی جو وہ کما کر خاندان کے لئے گھر لاتے ہیں"۔

میرے لئے یہ وضاحت قطعی ناکافی تھی اور مَیں کچھ بھی سمجھ نہ سکی۔ ویسے وہ جانتے تھے کہ مَیں سمجھ نہ سکوں گی لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ایک دن آئے گا جب مَیں ان سب باتوں کو اچھی طرح سمجھ سکوں گی۔ میری والدہ ہمیشہ کسی نہ کسی پروہت کو مجھے ہدایت کرنے کو کہتیں یا اگر میری طبیعت ناساز ہوتی تو میرے لئے

دعا کرنے کی درخواست کرتیں تو وہ مجھ پر اپنے ہاتھ رکھ کر دیوتاؤں سے استدعا کرتے کہ وہ مجھے شفا دیں۔ غالباً وہ دل ہی دِل میں مجھے اُس دیوی کی چیلی بلکہ مذہبی لیڈر بنانے کے خواب دیکھا کرتی تھیں، تاہم انہوں نے اِس کے متعلق اپنی زبان سے کبھی کچھ نہ کہا تھا۔ اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ مَیں بھی اُس راہ پر چلنے کیلئے رضامند تھی جیسے وہ میرے لئے ہموار کر رہی تھیں۔ دوسری عورتیں میری ذہانت اور مذہبی عقیدت کے لئے میری والدہ کی تعریف کرتیں اور کہتیں:

"آپ وفاداری سے اس کی تربیت کر رہی ہیں۔ دیوتا یقیناً یونیکو سے بہت خوش ہوں گے اور آپ کے خاندان کو صحت، خوشحالی اور دیگر بہت سی برکتیں ملیں گی۔"

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ننھی یونیکو کے متعلق ایسی خیال آرائی اُن کی خوش فہمی یا خام خیالی ثابت ہوئی کیونکہ میرے دل میں سرکشی اور خود مختاری کی زبردست خواہش موجزن تھی۔ لیکن اس وقت میں خود بھی اُس سے بے خبر تھی کیونکہ ابھی تک یہ جذبہ اُس شیر کی طرح تھا جو جھاڑی کے پیچھے سویا پڑا ہو، تاہم مَیں ابھی تک فرض شناس چھوٹی بیٹی تھی جو ماں کے اشاروں پر چلتی تھی اور ماں کو خوش کرنے کی خواہاں تھی۔ نیز جو سبق وہ مجھے سکھاتی تھیں مَیں انہیں اچھی طرح یاد کر لیتی تھی۔ مثلاً ٹنری کیو یعنی فہم الٰہی کے دین کی بانی ایک عورت تھی۔ میری والدہ نے مجھے بتایا تھا کہ عموماً وہ لوگ جنہیں خدا مذہبی قیادت کے لئے تیار کرتا ہے کئی سالوں کے

طویل عرصے تک مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ سوچ بچار اور گیان دھیان میں وقت گذارتے ہیں تاکہ اس طرح وہ مذہبی اصولوں کے پسِ پشت مخفی معانی کو جان سکیں اور بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو مدت تک جا بجا سفر کرتے، در در مارے پھرتے اور مختلف مندروں اور مقدس مقامات کی یاترا کرتے رہتے ہیں اور تب کہیں جا کر وہ دیوتاؤں کی نظر میں اتنی مقبولیت حاصل کرتے ہیں کہ کوئی روحانی تجربہ یا کشف حاصل کریں، لیکن ٹنری کیئو کی باقی خاتون ان چند برگزیدہ ہستیوں میں سے تھی جن کی زندگی اس قدر نیک پاک اور افکار اتنے اعلےٰ وارفع تھے کہ دیوتاؤں نے انہیں کسی تلاشِ مطلب یا تیاری کے بغیر ہی اپنے آپ کو اس پر ظاہر کر دیا۔ اس دیوی پر جو مکاشفہ ہوا وہ بالکل ایسا اچانک تھا جس طرح شب کو آسمان پر یکایک بجلی کی چمک۔ اسے اسکے لئے کوئی محنت مشقت کرنی نہ پڑی۔ یہ رویا اُسے بخشش کی طرح عطا کی گئی تھی۔

بہت سے لوگوں کا کہنا ہے مہا دیوتا نے (جو سب کا خالق اور بہت سے چھوٹے دیوتاؤں پر اختیار رکھتا ہے) اس کو اپنے قابو میں کر لیا تھا۔ اور اُس نے اُس کو بے خودی کی حالت میں لاکر اسے رویا بخشی اور اپنا پیغام عطا فرمایا اور اسے حکم دیا کہ وہ پیغام کل عالم کو سنائے۔

اس کے علاوہ اس بڑے دیوتا نے اس سے وعدہ کیا کہ وہ اس کے پیروکاروں کو خاص طور پر تین چیزیں عطا کرے گا۔ اوّل کہ وہ سب اچھی صحت و تندرستی کے مالک ہوں گے۔ دوم، اُنکے

خاندانوں میں امن و اطمینان قائم رہیگا اور سوم، اُنکی کاروباری مساعی اور اقدامات پھلدار اور کامیاب ہونگے۔ لیکن ان برکات کو حاصل کرنے کے لئے لازم تھا کہ ان کا اعتقاد اور ایمان مضبوط اور قوی ہو۔ نیز انہیں کچھ نقدی کا ہدیہ یا اپنے فارم کی پیداوار کا پہلا پھل مندر میں پیش کرنا تھا۔ پیداوار کے نذرانے کے لئے مزید ہدایت یہ تھی کہ وہ بہترین قسم اور جنس کا ہو۔

علاوہ ازیں مجھے یہ بھی بتایا گیا تھا کہ خدا نے اس معزز خاتون اور اس کے پیروکاروں کو بطور خصوصی برکات مریضوں کو شفا دینے اور آئندہ کے حالات کی پیش خبری دینے کی قدرت اور صلاحیت عطا کی تھی۔ میں اُس وقت بہت چھوٹی تھی اور میرا ذہن صاف سلیٹ کی طرح تھا جس پر جو چاہے لکھا جا سکتا تھا۔ میری والدہ نے بڑی محبت اور عقیدت سے مجھے مذکورہ بالا باتیں بتائیں تو میں نے بچوں کی طرح ان سب اُمور کو پرستش کا صحیح طریقہ مان کر قبول کر لیا۔ لیکن آج میں جانتی ہوں وہ پروہت ڈھونگ جیسے ساز، اور مناجات الاپنے کی آواز سے لوگوں پر ایسی وجدانی کیفیت طاری کر دیتے تھے کہ وہ بے خود ہو کر فرش پر بیٹھے عرش کی خبر لانے کا دعویٰ کرتے تھے۔

خیر میری ماں اس عقیدے سے بہت متاثر تھیں اور شکر کی بات یہ ہے کہ ان کے اس عقیدے کی وجہ سے گھر میں کوئی تفرقہ یا اختلاف رائے پیدا نہ ہوا۔ نہ ہمیں اس کی وجہ سے خاندانی معبد میں کوئی تبدیلی کرنی پڑی نہ میری والدہ نے نئی دیوی کے لئے

کوئی نیا متبرک چبوترہ بنانے کی ضرورت محسوس کی۔ میرا خیال ہے کہ میرے والد جو خود تو اس پر ایمان نہ رکھتے تھے تاہم خیال کرتے تھے کہ والدہ اگر نئے اور مختلف دیوتاؤں کی طرف راغب ہوئی ہیں تو اس میں کیا حرج ہے۔ ممکن ہے ان میں سے کوئی واقعی کچھ طاقت اور قدرت رکھتا ہو، اور اگر ایسا ہو تو مدد کے نئے ماخذ کی پشت پناہی حاصل کر لینے میں کیا مضائقہ ہے۔ قصہ کوتاہ یہ کہ ان کے اس عقیدے کو کم از کم ان کی ذات کے لئے بے چون و چراں تسلیم کر لیا گیا۔

لہٰذا ٹنزی کیو عقیدے سے میری والدہ کی وابستگی بے روک ٹوک بڑھتی چلی گئی۔ اگر مذہب سے عقیدت اور مذہب کے نام پر سخاوت کی وجہ سے ٹنزی کیو کے پیروکاروں کو دنیاوی برکات ملتی تھیں تو برکت پانے والوں میں اُن کا نام سرفہرست ہونا چاہیئے تھا، کیونکہ فیاض دلی سے خیرات کرنے میں بھی وہ ہمیشہ سرگرم کار رہتی تھیں۔ یہ سخاوت اور خیرات اُس دور میں بھی جاری اور ساری رہی جبکہ جنگ کے آخری سالوں میں ہر شے کی بڑی قلت تھی اور لوگ بمشکل اپنا پیٹ پال سکتے تھے۔ دراصل میرے والد اپنی ملازمت کے علاوہ فارم پر بھی اتنی ہی محنتِ شاقہ سے کام لیتے تھے گویا یہ اُنکی آمدنی کا واحد ذریعہ ہو، اور انہیں اچھی فصل کی شکل میں اپنی محنت کا پھل وصول ہو جاتا تھا۔ لہٰذا میری والدہ چاول، سویابین، مکّی اور سبزیوں میں سے بڑی فیاض دلی سے پروہتوں اور دیگر حاجت مندوں کا حصّہ نکالا کرتی تھیں۔

مجھے یہ معلوم نہیں کہ میرے والد قلت کے اُن ایام میں ایسی سخاوت کے متعلق کیا خیال کرتے تھے یا کیا انہوں نے کبھی والدہ کو ایسا کرنے سے منع کیا تھا۔ لیکن صرف اتنا جانتی ہوں کہ والدہ نے خیرات کا یہ کارِ خیر ہمیشہ جاری رکھا اور فارم کی پیداوار میں سے پروہتوں کو نذرانے پیش کرتی رہیں اور اس کے علاوہ دوسرے حاجت مند لوگوں کو بھی بخوشی اور بافراط حصّہ دیتی رہیں۔ اُنہی ایام میں انہیں مندر میں گھنٹی کا انچارج بنا کر اسسٹنٹ لیڈر بنا دیا گیا اس پر میری والدہ بہت خوش اور شادمان ہوئی تھیں۔

لیکن افسوس ہے کہ اس خوشی کے جلد بعد ہی انہیں مُصیبت سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ مصیبت بیماری کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ اُس وقت میری عمر پندرہ سال کی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ مَیں تب بے حد خوفزدہ ہوگئی تھی۔ نیز یہ کہ مَیں نے والدہ کے ہم اعتقاد احباب سے کوئی روشن اُمید وابستہ نہ کی تھی جو اس امر کے قائل تھے کہ ان کے مذہبی عقیدے کی وجہ سے اُن کو دوبارہ صحت مل جائے گی، یا ٹنری کیٹو کے پیروکار انہیں شفا دے سکتے ہیں۔ حالانکہ اس دن ہمارے گھر میں ان کے خوب بھرمار تھی۔ وہ سب دعائیں الاپتے اِدھر سے اُدھر آجا رہے تھے۔ ان میں سے بعض والدہ پر ہاتھ رکھ رکھ کر دیوتاؤں سے ان کی شفا کے لئے مناجات کر رہے تھے۔

"تمہاری والدہ تندرست ہوجائیں گی"

ہماری ہمسائی نے مجھے یقین دلاتے ہوئے کہا۔ یہ ہمسائی ہمارے ساتھ مندر جایا کرتی تھی۔

"اِس میں کیا شک ہے۔ ہم نے گھنٹی بجا کر مناجات کی اور دعائیں الاپی ہیں۔ ہم نے انہیں متبرک پانی پلایا ہے۔ ویسے بھی وہ بہت با اخلاق اور ایماندار خاتون ہیں۔ دیوتا ضرور ان پر رحم کر کے انہیں شفا دیں گے۔"

ایک اور نے پُرزور لہجے میں اس کے خیال کی تائید کی۔

لیکن یہ سب کچھ دیکھنے اور سننے کے باوجود اس وقت پہلی مرتبہ مجھے یہ احساس ہوا کہ میں والدہ کے مذہب کی طرف محض اِس لئے مائل ہوئی تھی کہ میرے ایسا کرنے سے انہیں خوشی حاصل ہوتی تھی۔ بے شک میں یہ تسلیم کرنے کو تیار نہ تھی کہ والدہ فوت بھی ہو سکتی ہیں لیکن میں اُن کے مذہبی عقیدے کی اتنی قائل نہ تھی کہ یہ تسلیم کر سکوں کہ ان خیر اندیش دوستوں کی دعاؤں اور جھاڑ پھونک سے وہ صحت یاب ہو سکتی ہیں۔ اپنے والد کی طرح اگر مجھے کسی پر اعتقاد تھا تو وہ اپنے ڈاکٹر پر تھا۔

خیر میں اس دن والدہ کے آس پاس منڈلا رہی تھی کہ اگر ضرورت ہو تو اُن کے کسی کام آسکوں۔ اِس دوران میں میں احساس ندامت سے آب آب ہوئی جاتی تھی کہ میں نے حال ہی میں لباس کے معاملے میں لاپرواہی کر کے ان کو ملال پہنچایا تھا اور شام کو زیادہ دیر گھر سے باہر رہ کر اُن کو پریشان کیا تھا۔ میری اس وقت یہ حالت تھی کہ ان کو تندرست و توانا دیکھنے کے لئے میں اپنی جان پر کھیل جانے کو تیار تھی۔

والدہ کی بیماری سے ہمارے گھر کا نقشہ بدل گیا۔ دِن جوں توں

گذرتے گئے۔ پھر رفتہ رفتہ بتدریج اُن کی کمزوری دُور ہوتی گئی۔ مگر اُن کا دایاں بازو، اور بائیں ٹانگ ساکت اور بے حس ہو گئے تھے اور علاج معالجے سے اُن میں ذرّہ بھر افاقہ نہ ہُوا تھا۔ یہ اعضا فالج زدہ تھے۔ غرض اسی طرح کئی مہینے گذر گئے! اور ڈاکٹر ہمیں کوئی اُمید نہ دِلا سکا کہ ہم انہیں کبھی دوبارہ چلتے پھرتے یا اپنے گھر کی دیکھ بھال کرتا دیکھیں گے۔ ماں کو اس طرح بے بس اور لاچار دیکھ کر میرا دل خون کے آنسو روتا تھا۔ اور اس پر طرّہ یہ کہ اُن مشکل ایّام میں گھر اور ماں کی دیکھ بھال کرنے کی ساری ذمہ داری بھی میرے شانوں پر آن پڑی۔ میرے دونوں بھائی کالج میں زیرِ تعلیم تھے۔ بلکہ بڑے بھائی کی تو شادی بھی ہو چکی تھی۔ میری بہن یورپکو سلائی کے سکول سے تربیّت حاصل کرنے کے بعد ملازمت کر رہی تھی۔ والد اپنی ملازمت کے علاوہ فارم پر بدستور کام کرنے جاتے تھے۔ لہٰذا گھر گرہستی اور بیمار ماں کی خبر گیری اور تیمارداری میرے حصّے آئی۔

کڑی مصیبت کے ان ایام میں بھی مجھے گھر میں صفائی اور رکھ رکھاؤ کے اُسی معیار کو قائم رکھنا تھا جو والدہ کی بیماری سے پہلے قائم ہو چکا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ مجھے باورچی خانے کا لکڑی کا فرش صاف کرنا پڑتا تھا، جسے میں چاولوں کے چوکر سے کپڑے کے ساتھ رگڑ رگڑ کر چمکایا کرتی تھی۔ ناشتے کے لئے چاول اور مچھلی تیار کرتی اور والد کے دوپہر کے کھانے کے لئے ساتھ لے جانے کو گوشت اور سبزی، مچھلی، خشک چاول اور چائے وغیرہ تیار کرتی۔ اس کے علاوہ سارے گھر کی صفائی کرنا، سب کے کپڑے تہ کر کے

ٹھکانے لگانا اور شام کی چائے کا بندوبست کرنا سب میرے ذمے تھا۔ علاوہ ازیں والدہ کی دیکھ بھال کرنا جس میں اُن کے بال بنانا میرے لئے مشکل ترین کام تھا کیونکہ مجھے یاد ہے کہ مَیں کبھی اُن کی مرضی کے مطابق اُن کا جوڑا نہ بنا سکی۔ جب مَیں ان کے بال بناتی تو وہ کبھی مطمئن نہ ہوتی تھیں اور کہتیں:

"نہیں۔ نہیں۔ یونیکو میں اپنے بال اِس طرح بنانا نہیں چاہتی۔ اِن بالوں کو اوپر کی طرف لاؤ۔ یوں" یہ کہتے ہوئے وہ ہاتھ سے اشارہ کرتیں تاکہ میں اچھی طرح سمجھ سکوں۔ اور تب مَیں انکے لمبے کالے بال کھول دیتی اور دوبارہ کوشش کرتی جس کا مطلب تھا بال سنوارنے کا مرحلہ الف سے شروع کرنا پڑتا۔ بالوں کی اِسی ادھیڑ بُن میں بعض مرتبہ میں اِس قدر سٹپٹا جاتی کہ میری آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ اِس لئے نہیں کہ مَیں ماں کی خدمت کرنا نہیں چاہتی تھی بلکہ اِس خیال سے کہ مَیں اُن کو خوش نہیں کر پاتی تھی۔ نہ صرف مجھے سب کام کرنے ہوتے تھے بلکہ ہر کام میں والدہ کی ہدایات پر سختی سے عمل کرنا ہوتا تھا۔ مثلاً وہ کہتیں:

"یونیکو تم نے برآمدے میں سامنے سامنے جھاڑو دیا ہے۔ دوبارہ جھاڑو دو اور اب کی مرتبہ کونوں کو بھی اچھی طرح صاف کرو۔"

اُس وقت میں سوچتی تھی کہ وہ میرے کام میں کیڑے نکالتی ہیں لیکن آج میں محسوس کرتی ہوں کہ وہ بچاری ان دنوں اپنے آپے میں نہیں تھیں۔ اُن کی زندگی آناً فاناً بدل گئی تھی۔ وہ ہمہ وقت کام میں جتی رہنے والی ہستی تھیں اور اب پلنگ کی پٹی سے

لگی رہنے پر مجبور تھیں۔ اور اب حالانکہ اُن کے جسم کے بعض اعضا کام کرنے سے انکار کر چکے تھے تاہم اُن کا دماغ تاحال اسی طرح کام کرتا تھا۔ اِس صورت میں وہ اپنے دل کے غم و غصّے کی بھڑاس لاشعوری طور پر اِس طرح نکالتی تھیں کہ میرے کام میں نقص نکالیں۔ لیکن اس وقت مجھے یوں معلوم ہوتا تھا کہ میں اتنی نالائق ہوں کہ وہ مجھ سے ناخوش اور ناراض ہیں اور چونکہ اِس سے پہلے وہ مجھ سے ہمیشہ دھیمے لہجے میں بات کرتیں لہٰذا ان کے طرزِ تکلّم میں یہ تبدیلی میرے دل کو بہت شاق گذرتی۔ میں خیال کرتی کہ اُن کے دِل سے میرا پیار ختم ہو چکا ہے۔ آہ کتنے صبر آزما دن تھے وہ بھی!

تب ایک دن والد صاحب اپنے ساتھ یہ خبر لائے کہ انہوں نے سنا تھا کہ وہاں سے تقریباً ۲۰۰ میل کے فاصلے پر گرم پانی کے چشمے موجود ہیں جن میں غسل کرنے سے میری ماں کی طرح کے فالج زدہ مریض شفایاب ہو جاتے ہیں۔ یہ بتانے کے بعد میرے والد میری والدہ کو مخاطب کر کے نرم لہجے میں بولے

"میں آپ کو اور یونیکو کو وہاں لے جاؤں گا اور آپ دونوں جتنی دیر ضرورت ہو وہاں قیام کر سکتی ہیں"

اُس وقت میں اپنی والدہ کا دبلا پتلا چہرہ تک رہی تھی اور دل ہی دِل میں ڈر رہی تھی کہ کہیں وہ اِس طرزِ علاج کو بھی اپنے مذہبی عقیدے کے خلاف نہ سمجھیں۔ ممکن ہے یہ خیال اُن کے دل میں ابھرا ہو کیونکہ اپنے محبوب ٹنری کیٹو پر اُن کا قوی ایمان تھا۔ لیکن وہ اِس کے ساتھ فرض شناس بیوی بھی تھیں۔

بہرحال ہم اُن چشموں کی زیارت کو گئے۔ اور اس موسم گرما میں ایک چھوٹے سے کمرے میں ایک پورے ماہ تک رہے۔

یہ کمرہ گرم چشمے سے قریباً ۲۰۰ قدم کے فاصلے پر تھا جو ہمیں پیدل طے کرنا ہوتا۔ وہاں جانے کے لئے میں والدہ کے پاؤں کے ساتھ اُن کے نرم سلیپر باندھ دیا کرتی تھی تاکہ گھسٹ گھسٹا کر بمشکل تمام چلتے وقت وہ پاؤں سے اُتر کر گم نہ ہو جائیں۔ پھر میں اُن کے ہاتھ میں چھڑی تھما دیتی۔ لیکن چھڑی کے باوجود انہیں میری مدد و معاونت کی اس قدر ضرورت ہوتی کہ چشمے تک پہنچتے پہنچتے میں خود بالکل تھک جاتی۔ یہاں پہنچ کر والدہ پانی میں اتر جاتیں تو میں اُن کے ساتھ اندر جاتی، لیکن جب شدید حرارت کو برداشت نہ کر سکتی تو باہر آ کر ساتھ والی روش پر ان کا انتظار کرتی۔ لیکن وہاں سے نہ ٹلتی کیونکہ میں ان کے قریب ہی رہنا چاہتی تھی تاکہ اگر انہیں میری ضرورت ہو تو میں ایکدم اُن کے پاس پہنچ سکوں۔ وہ جتنی دیر گرم پانی کی حرارت کو برداشت کر سکتی تھیں اتنی دیر پانی کے اندر رہتیں۔

اور اس اثنا میں میں قریب کھڑی اپنے اردگرد نگاہ دوڑاتی اور دیکھتی کہ گو میرے اردگرد سب مریض ہی تھے مگر وہ سب کے سب میری والدہ سے کم مصیبت زدہ نظر آتے۔ میں انکو اپنی ماں سے کم تکلیف میں پاکر کڑھتی اور انہیں حسد کی نگاہ سے دیکھتی اور دل ہی دل میں کہتی کہ کاش ان میں سے کسی ایک کو میری ماں کی تکلیف ہوتی اور ان کی ہلکی تکلیف میری ماں کو۔ آخر اُن جیسی

نیکدل، مہربان اور سخی خاتون کو اتنی شدید اذیت سے کیوں پالا پڑا ہے۔ چشمے کے قریب کھڑے ہو کر والدہ کا انتظار کرتے ہوئے کبھی کبھی مجھے احساسِ تنہائی ستانے لگتا اور میرا جی چاہتا کہ کسی طرح اُڑ کر گھر پہنچ جاؤں۔ تاہم میں گھر آنے سے زیادہ ماں کو تندرست دیکھنے کی خواہشمند تھی۔

یہ قدرتی بات ہے کہ ہم ہر غسل کے بعد ان کی حالت میں نمایاں تبدیلی کی توقع کرتے تھے۔ یہاں پر اپنے قیام کے پہلے ایام جن میں میری والدہ کی حالت میں کوئی خاص تبدیلی نظر نہ آتی تھی ہم دونوں کے لئے خاصے کڑے اور صبر آزما تھے۔ تاہم میں اکثر پُرامید لہجے میں اُن سے کہتی:

"آپ پہلے کی نسبت بہتر نظر آتی ہیں۔"

گویا ایسا کہہ دینے سے کسی نہ کسی طرح واقعی یہ بات سچ ثابت ہو سکتی تھی۔

"ہاں میرا بھی یہی خیال ہے میں اپنی انگلیوں کو ذرا سی حرکت دے سکتی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ اپنی انگلیوں کو جنبش دینے کی بے سود کوشش کرتیں اور میں یہ سوچ کر دل تھام کر رہ جاتی کہ یوں کرتے ہوئے وہ کتنی اذیت برداشت کر رہی ہیں۔ وہ کہتیں

"دیکھا تم نے؟"

"واقعی" میں اپنے لہجے میں مصنوعی گرمجوشی پیدا کرتے ہوئے کہتی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم دونوں جانتے تھے کہ ہم دونوں

ایک دوسرے کی ڈھارس بندھانے کی خاطر یہ ڈھونگ رچا رہے ہیں اور اسی طرح یہ ڈرامہ کئی بار کھیلا گیا۔ لیکن اس کے باوجود میری والدہ صبر و استقلال سے ہزار وقت چشمے میں غسل کے لئے جاتی رہیں۔ اور پھر ایک دن وہ بھی آیا جب اس صبر و استقلال کے آثار رونما ہونے شروع ہوئے، اور گرم معدنی پانی کی حرارت یا اپنی خود مختاری کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے والدہ کی قوتِ ارادی کی استقامت سے ان کی بیماری کے وہ بندھن ڈھیلے ہونے شروع ہوئے جنہوں نے اُن کی ٹانگ اور بازو کو جکڑ رکھا تھا۔ پہلے پہل تو وہ اپنے پاؤں کو بالکل تھوڑی سی حرکت دے سکتی تھیں کیونکہ یہ بندھن ٹوٹے نہیں بلکہ صرف ڈھیلے ہی ہوئے تھے۔ مگر بعد ازاں بتدریج اُن کے گھٹنے بھی ٹھیک ہوتے چلے گئے۔ اُدھر یہی عمل اس اثنا میں اُن کے بازو پر بھی جاری تھا۔ ایک دن انہوں نے اپنی کلائی کو ہلانے کی سعی کی تو وہ انکی مرضی کے مطابق حرکت کرنے لگی۔ پھر کہنی اور ہاتھ کی انگلیاں جنبش کرنے لگی۔ اُن کے مرض نے بالآخر ہار مان لی تھی۔ وہ فاتحانہ اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر بولیں:

"یونیکو دیکھو"

آج ہم میں سے کسی کو ہاتھ کی حرکت کے متعلق کسی ایکٹنگ یا اداکاری کی ضرورت نہ تھی۔ مجھے یاد ہے کہ مدت بعد پہلی مرتبہ اُس مشفق ہاتھ کو جنبش کرتے دیکھ کر میری کیا حالت ہوئی تھی۔ میں خوشی کے مارے باولی ہوئی جاتی تھی۔ فرطِ جذبات سے میری آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ میرے چہرے پر ہنسی تھی لیکن آنکھوں سے آنسو

بہہ رہے تھے۔ مگر یہ خوشی اور مسرت کے آنسو تھے کہ ہماری دوڑ دھوپ کارآمد ثابت ہوئی۔

اس کے بعد والدہ کی حالت میں ہر روز نمایاں فرق پڑتا گیا۔ اور اُس ماہ کے آخر تک وہ میری مدد کے بغیر چل پھر سکتی تھیں۔ اب صرف انہیں کھڑا ہوتے وقت لاٹھی کا استعمال کرنا پڑتا تھا تاکہ وہ اپنے قدموں پر اچھی طرح کھڑا ہو سکیں۔ یقیناً اُن کی صحت یابی ہمارے لئے بڑی اہمیت رکھتی تھی گویا ہم نے کوئی بہت بڑی مہم سر کر لی ہو۔ جب ہم گھر واپس آئے تو ہم سب کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔

گھر واپس آنے پر والدہ اپنے مذہبی اُمور اور رسوم میں پہلے سے زیادہ دلچسپی اور گرمجوشی کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ گویا اُن کے ہم اعتقاد احباب کی مناجات کے جواب میں انہیں صحت ملی ہو۔ میں اس بارے میں اُن کی دلائل کو تو تسلیم نہ کرتی تھی تاہم مجھے اُن کی زبان سے ان کی صحت یابی کا بیان سُن کر کوئی خاص الجھن نہ ہوتی تھی۔ میں سوچتی تھی کہ اصل مقصد تو ان کا صحت یاب ہونا تھا سو پورا ہُوا، خواہ وہ گرم چشمے سے نہانے سے حاصل ہُوا ہو یا ٹنزی کیوُ کے پیروکاروں کے دم درود کرنے سے۔ وہ سرعت سے روبصحت ہو رہی تھیں اور قریباً بالکل تندرست تھیں۔ ہمیں اس سے زیادہ کیا چاہیئے تھا؟

اُن دنوں والدہ کا یہ معمول تھا کہ وہ روز صبح سویرے آس پاس کے علاقے میں چہل قدمی کرنے جایا کرتی تھیں۔ وہ چھوٹی پہاڑی

کی ڈھلان سے آہستہ آہستہ نیچے اُتر کر نیچے پارک میں جاتی تھیں جہاں پہنچ کر وہ پیچ و خم کھاتے راستے پر اِدھر اُدھر قدم مارتی رہتیں۔ اور یہ ایک ایسا معمول تھا جس پر وہ باقاعدگی سے عمل کرتی تھیں تاکہ اِس طرح نہ صرف بہار کی کھلی اور لطیف ہوا سے لُطف اندوز ہو سکیں بلکہ اِس طرح اپنی کمزور ٹانگ کو چلنے پھرنے کی مشق مہیا کر کے اُسے نقل و حرکت کا عادی بنا سکیں۔

ایک دن جب وہ معمول کے مطابق اسی طرح سیر کے لئے گھر سے نکلیں تو مَیں یکایک گھبرا گئی۔ کیونکہ اس دن ایک عجیب سا انجانا خوف میرے دل پر چھا گیا اور مَیں نے اُن کے ساتھ چلنے کا ارادہ کر لیا۔ عموماً وہ مجھے ساتھ لے جانے سے خوش ہُوا کرتی تھیں لیکن اُس صبح وہ اکیلے جانے پر اصرار کر رہی تھیں۔ تاہم میں ان کے ساتھ ہو لی اور ہم پارک کے آدھے راستے تک اکٹھے چہل قدمی کرتے چلے آئے۔ تب وہ رُک کر فیصلہ کن لہجے میں بولیں۔

"یونیکو۔ تمہیں میرے ساتھ آگے جانے کی ضرورت نہیں"۔

"شاید آپ کو میری مدد کی ضرورت پڑے"۔

"نہیں پگلی۔ مَیں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ تم واپس چلی جاؤ"۔

تاہم مَیں کسی طرح واپس جانے پر آمادہ نہ تھی۔ وہ انجانا خوف میرے دل پر بدستور چھایا ہُوا تھا اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا میرے لئے والدہ کے ساتھ چلنے کا آخری موقع ہو۔ گھر واپس جانے میں میرے تامل اور توقف پر وہ کسی قدر تلخ لہجے میں بولیں "بھئی مَیں نے کہہ جو دیا کہ مجھے تمہاری ضرورت نہیں۔ مَیں اپنی سہیلی

کے ہاں کچھ دیر ملاقات کے لیے ٹھہرنا چاہتی ہوں۔ لہٰذا تم گھر واپس چلی جاؤ۔"

میں اس واضح حکم کی خلاف ورزی کرنے کی جرأت نہ کر سکی اور با دلِ نخواستہ گھر کی طرف ہو لی۔ والدہ راستے میں کھڑی ہو کر مجھے تک رہی تھیں۔

غالباً ڈاکٹر صاحب ہمیں آگاہ کر سکتے تھے کہ ان پر فالج کا حملہ جس طرح پہلے قطعی اچانک ہوا تھا اُسی طرح یکایک دوبارہ بھی ہو سکتا ہے مگر بدقسمتی سے انہوں نے ایسا نہ کیا اور ہم اِس خوش فہمی میں رہے کہ اُس موذی مرض کا خطرہ، ہمیشہ کے لیے ٹل چکا ہے۔

تو ہاں اُس وقت ہمراہ چلنے سے سختی سے منع کر دیے جانے پر میں بوکھلائی سٹپٹائی سی گھر کی طرف پہاڑی پر چڑھ رہی تھی اور میں نے پلٹ کر پیچھے دیکھنے کی ہمت بھی نہ کی تھی۔ میں نے بارہا یہ سوچا ہے کہ والدہ نے مجھے ساتھ چلنے سے کیوں منع کیا تھا! کیا انہیں کسی طرح آنے والے واقعہ کا احساس ہو گیا تھا اور وہ نہیں چاہتی تھیں کہ میں انہیں گرتا دیکھوں یا کیا وہ اس دن یونہی جھنجھلا سی گئی تھیں کہ میں کیوں ان کا دم چھلا بنی رہتی ہوں! خیر اب یہ بات ہمیشہ پردۂ راز میں رہے گی۔ لیکن اُس صبح بھی میں اسی سوچ میں غرق قدم مارتی چلی جا رہی تھی۔

پھر مجھے اس ہمسائی کا خیال آیا جس سے والدہ ملنے جا رہی تھیں۔ یہ بی ہمسائی چونکہ حال ہی تھیوسوفی کے عقیدے کی طرف مائل

ہوئی تھیں اس لئے اُن میں نئے عقیدے کے متعلق نہایت ہی جوش و خروش اور گرمجوشی پائی جاتی تھی۔ وہ بڑے جوش و جذبہ اور ولولے سے اس عقیدے کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا کرتی تھیں اور یہی وجہ تھی کہ میری والدہ اور ان میں گاڑھی چھنتی تھی۔ خیر میں اُن دونوں کی دوستی کے متعلق سوچتی اپنے گھر کے آدھے راستے تک پہنچی ہوں گی کہ والدہ لاٹھی پر جھکی ہوئی اپنی اس سہیلی کے صحن میں داخل ہوئیں۔

وہ آہستہ آہستہ مکان کے دروازے کی طرف بڑھ رہی تھیں کہ اُس گھر کا کتا جس کا اُس لمحے تک انہوں نے خیال نہ کیا تھا مکان کے ایک کونے سے نکل کر بھونکتا ہُوا ان کی طرف لپکا۔ یہ کتا ان سے اچھی طرح شناسا تھا اور حالانکہ وہ اُن کو دیکھ کر ایک آدھ مرتبہ بھونک لیا کرتا تھا مگر اُس نے اُن پر کبھی حملہ نہ کیا تھا۔ ممکن ہے اُن کے ہاتھ میں لاٹھی دیکھ کر وہ طیش میں آگیا ہو یا اُن کے ڈگمگاتے قدموں سے اس نے یہ سمجھا ہو کہ اس طرح اس کے زیرِ نگرانی خاندان کو کوئی خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ بہرحال وہ بڑی تندی سے بھونک رہا تھا۔ مَیں نے بھونکنے کی آواز سنی تو ایکدم پیچھے کی طرف پلٹی۔ حالانکہ میں والدہ کو دیکھ نہیں سکتی تھی مگر جانتی تھی کہ وہ سخت مشکل میں گرفتار ہیں۔

اب میں بگٹٹ بھاگتے، دور سے اُنہیں دیکھ رہی تھی۔ بڑا کتا صحن اور مکان کے درمیان اکڑوں بیٹھے بھونک رہا تھا اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ ابھی وہ والدہ پر پل پڑے گا۔ والدہ دونوں

ہاتھوں سے لاٹھی پکڑے تن تنہا کھڑی تھیں۔ پھر وہ لڑکھڑا گئیں اور زمین پر گر پڑیں۔ میں پہاڑی ڈھلان سے گویا اڑتی ہوئی نیچے آئی اور کتے کا خیال نہ کرتے ہوئے ان پر جھک گئی۔ پھر میں ان کو ہلا ہلا کر اُن سے اٹھنے کی منتیں کرنے لگی مگر اُن کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔

اب تک اس پڑوس کے لوگ ہم تک بھاگے چلے آ رہے تھے۔

"ڈاکٹر کو بلاؤ۔ ارے کوئی ڈاکٹر کو بلائے"

میں نے پکار کر کہا۔ لیکن اس کے جواب میں والدہ کی سہیلی کی آواز سنائی دی۔

"نہیں۔ قطعی نہیں۔ ڈاکٹر کو بلانے سے سارا معاملہ بگڑ جائیگا۔ ہمارے پاس متبرک پانی ہے جس پر پروہتوں نے دعائیں پڑھی ہیں۔ اگر وہ اسے پی لے تو یقیناً ٹھیک ہو جائیگی"

دو سال پیشتر جب والدہ پر فالج کا حملہ ہوا تھا تو میں نے اُنکی یہی حالت دیکھی تھی۔ اُن کی رنگت سپید ہو چکی تھی۔ آنکھیں بند تھیں اور انہیں سانس لینے میں دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ بیشک میری عمر اس وقت زیادہ نہ تھی تاہم میں نے جان لیا کہ اسی مرض نے ان پر دوبارہ حملہ کر دیا ہے۔

"ڈاکٹر کو بلا دیجئے۔ مہربانی سے کوئی ڈاکٹر کو بلا لائے"، میں نے دوبارہ دہائی دی۔

عورتوں میں سے ایک ڈاکٹر کو بلانے کے لئے جانا ہی چاہتی تھی کہ والدہ کی وہی سہیلی جس کی ملاقات کو وہ آئی تھیں اُس کا

راستہ روک کر کھڑی ہو گئی اور بولی۔

"اگر تم ڈاکٹر کو بلانے گئیں تو تم اس کی موت کی ذمہ دار ٹھہرو گی۔ وہ نیک اور ایماندار عورت ہے۔ دیوتا اسے شفا دینگے۔"

اس کے بعد اس نے مجھے دھکیل کر پیچھے کر دیا اور اُن کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اور پانی کا چمچ اُن کے منہ میں ڈالتے ہوئے بولی:

"اسے پیو۔ تھوڑا سا پینے پر بھی تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔"

"ارے یونیکو۔ دیکھا تم نے؟ اس نے پانی پی لیا ہے۔ دیوتا اُسے شفا بخشیں گے اور بھی عمر اور بڑی خوشی عطا کرینگے۔"

اُس وقت میرا دل میرے اندر بیٹھا جا رہا تھا۔ ویسے میں نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے جو دیکھا تھا وہ یہ تھا کہ سارے کا سارا پانی اُنکے لبوں کے دونوں طرف سے ہوتا ہوا تھوڑی پر بہہ نکلا اور ان کے حلق میں ایک بوند بھی نہ پہنچی تھی۔ اگر میری عمر اس وقت ذرا بڑی ہوتی یا مجھ میں اپنے پر کچھ زیادہ اعتماد ہوتا تو میں ہمسائی کے انکار، احتجاج اور عتاب کی پرواہ کئے بغیر ہی ڈاکٹر کو بلوا لیتی۔ میں والد کو بلانا چاہتی تھی کیونکہ میں سمجھتی تھی کہ وہ جو قدم اٹھائیں گے صحیح ہوگا مگر شومئی قسمت کہ اُن کو بلا لانا میرے لئے ناممکن تھا کیونکہ وہ کام پر جا چکے تھے اور مجھے معلوم نہیں تھا کہ ان تک کس طرح پیغام پہنچاؤں۔

والدہ تا حال صحن میں اُسی جگہ جہاں وہ گر گئی تھیں چت پڑی تھیں۔ دراصل اُن کی دوست کو یہ اُمید تھی کہ وہ کسی لمحے آنکھیں کھول دیں گی اور پھر اپنے قدموں پر کھڑی ہو کر اندر چائے پینے

جائیں گی۔ بلکہ وہ اس خیال ہی میں بڑی پُرجوش نظر آرہی تھیں کہ تھوڑی دیر میں کوئی معجزہ رُونما ہونے والا ہے جس کا سہرا شنری کیٹو کے عقیدے کے سر ہوگا اور جس کی وجہ سے اس عقیدے کا مذاق اڑانے والے بھی کشاں کشاں اُس کی طرف چلے آئیں گے۔

لیکن جب ایسی کوئی چیز رونما نہ ہوئی تو میں انہیں یوں بے بسی سے زمین پر لیٹے نہ دیکھ سکی۔ میں نے کسی دروازے کا تختہ تھوڑی دیر کے لئے مستعار لیا اور انہیں اُس پر لٹا کر اندر پہنچایا اور آخر کار جب سہ پہر ڈھلنی شروع ہوئی تو میں اس صورتحال کو مزید برداشت نہ کر سکی اور کسی سے کچھ کہے بغیر وہاں سے کھسک گئی اور اپنے فیملی ڈاکٹر کو ٹیلیفون کیا جو ایکدم وہاں پہنچ گئے۔

ڈاکٹر صاحب نے بڑے غور سے ان کا معائنہ کیا اور پھر بڑی سنجیدگی سے بولے:

"خاتون فالج کے شدید حملے کی زد میں ہیں۔ آپ لوگوں کو بہت پہلے مجھے اطلاع کرنی چاہیئے تھی۔ آپ نے بہت دیر کردی ہے"۔

انہوں نے بعد ازاں چند مردوں کی مدد سے اُٹھوا کر والدہ کو گھر پہنچایا۔ لیکن انہیں اُن کے بچ رہنے کی کوئی اُمید نہ تھی۔ وہ کہہ رہے تھے:

"اگر مجھے بروقت بُلا بھی لیا جاتا تو بھی اس کا بچنا محال تھا لیکن اب تو۔۔۔"

یہ کہتے ہوئے انہوں نے ہاتھ سے نامیدی کا اشارہ کیا۔

تین دن تک میں ماں کے پلنگ کی پٹی سے لگی رہی۔ مجھے اپنے

کھانے کی ہوش تھی نہ سونے کا خیال۔ میرے والد بھی متواتر وہاں موجود والدہ کو ٹکٹکی لگا دیکھ رہے تھے مگر منہ سے کچھ نہ کہتے تھے۔ اُنکے لبوں پر گویا مُہر کر دی گئی تھی۔ مَیں نے ڈاکٹر کو والد صاحب، بڑے بھائی اور اس کی بیوی سے زیرِ لب باتیں کرتے سُن لیا تھا اور جانتی تھی کہ میری والدہ موت کے منہ میں ہیں اور اب میں اُن کی آواز کبھی نہ سنونگی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اگر میں یہ باتیں نہ بھی سُنتی تو بھی مجھے معلوم ہو جاتا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ جس لمحے میں نے کتے کے بھونکنے کی آواز کو سنا تھا اور پھر والدہ کو گرتے دیکھا تھا اُسی وقت سے مَیں اِس دردناک انجام سے واقف تھی۔

جب مَیں سکول سے دو تین دِن لگاتار غیر حاضر رہی تو والد نے مجھ سے سکول جانے کو کہا۔ انہوں نے کہا کہ ہو سکتا ہے والدہ کچھ عرصے تک اُسی حالت میں رہیں۔ نیز انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ وہ خود ان کے پاس ہی رہیں گے اور ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھیں گے۔ بے شک میں والدہ سے جُدا ہونا نہیں چاہتی تھی مگر والد سے بحث کرنے کا مجھے خیال تک نہ آیا۔ ویسے بھی میرے حواس گویا جواب دے چکے تھے۔ لہٰذا میں چُپ چاپ چلی گئی۔

لیکن اسی سہ پہر سکول میں مجھے پیغام ملا کہ گھر آ جاؤ۔ اِسکے علاوہ کچھ نہیں کہا گیا تھا اور نہ مجھے کسی وضاحت کی ضرورت تھی۔ مَیں جانتی تھی کہ والدہ اِس جہان سے کُوچ کر گئی ہیں۔

ہمارے وہ ہمسائے جو ٹنری کیوفرقے کے ممبر تھے اور والدہ

کے بہترین دوست تھے اُن کی وفات پر بہت برہم ہوئے اور آپس میں اُن کے خلاف طرح طرح کی چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ مثلاً "اُس کی موت سے ثابت ہو گیا ہے کہ اُس کا ایمان دراصل بہت کمزور تھا۔ وہ ہمارے سامنے ریاکاری کرتی رہی۔ وہ ہمیں تو دھوکا دیتی رہی مگر دیوتاؤں کو دھوکا نہ دے سکی۔"

"یہ مت بھولو کہ وہ کتنی فیاض تھی۔ جنگ کے دنوں میں جب ہر شے کی اتنی قلت تھی وہ اپنے کھیت کی پیداوار میں سے ہم سب کا حصّہ نکالتی رہی۔"

کسی مہربان نے رائے دی۔

"نکالتی تھی تو کیا ہُوا۔ اس کی سخاوت یقیناً دیوتاؤں سے اپنے لئے فیض حاصل کرنے کی نیت سے ہوگی اور انہوں نے ایسی سخاوت کو پاؤں کی گرد سمجھا۔"

غرض یہ کہ فالج کے عارضہ سے موت کا شکار بن کر والدہ نے اُن کے جلیل القدر مذہب کے اصولوں کی خلاف ورزی کی تھی۔ اُن کی دانست میں یہ اُن کی اپنی خطا تھی کہ دیوی نے انہیں شفا نہ بخشی تھی۔ لہٰذا وہ میری والدہ سے اس قدر مایوس اور ناراض تھیں کہ انہوں نے ہمارے ہاں رسمی ماتم پُرسی کے لئے بھی قدم نہ رکھا بلکہ گلی میں اتفاقیہ ملنے پر بھی وہ منہ پھیر لیتی تھیں۔ بے شک مذکورہ بالا باتیں انہوں نے ہمارے روبرو نہ کہی تھیں لیکن یہ سب باتیں ہمارے کانوں تک پہنچ گئیں۔ کیونکہ ہمارے دیگر احباب نے یہ سب کچھ سُن لیا تھا اور رفتہ رفتہ

ہمارے سننے میں بھی آگیا اور اُن کا اپنا رویّہ انکے نظریے کی تائید کرتا اور ہمارے زخموں پر نمک پاشی کرتا رہا۔

لیکن میرے لئے انکے الفاظ، انکے خیالات اور نظریات کوئی اہمیّت نہ رکھتے تھے۔ مجھے اپنی زندگی میں ایک ایسا خلا نظر آتا تھا جس کا پُر ہونا محال تھا۔ اِس سے پیشتر مجھے یہ احساس نہ ہُوا تھا کہ میری والدہ میرے لئے کیا حیثیت اور کیا اہمیّت رکھتی ہیں اور ان کی غیر موجودگی مجھ پر کتنی گراں گذرے گی اور میں ان کی کمی کو کتنی شدت سے محسوس کروں گی۔ اب زندگی مجھے بالکل خالی، بے مزہ اور بے معنی لگتی تھی۔ اور ٹنری کیٹو کے عقیدے کیلئے میرے دل میں اگر کوئی جذبہ تھا تو وہ نفرت کا جذبہ تھا۔ ہاں شدید بلکہ انتہائی نفرت کا جذبہ۔ میرے نزدیک مذہب ڈھول کی طرح تھا جس کا شور زیادہ ہو اور اندر سے کھوکھلا ہو۔ ہاں سراسر ڈھونگ۔

چوتھا باب

آنے والے ہفتے اور ماہ میرے لیے ایسے ہولناک اور ہیبت ناک خواب کی مانند تھے جس میں سب کچھ عجب طرح گڈمڈ اور خلط ملط ہو کر رہ گیا ہو اور کوئی چیز صاف اور واضح نظر نہ آتی ہو۔ والدہ کی وفات کے بعد میری زندگی نئی ڈگر پر چل نکلی۔ میں سکول جاتی، گھر واپس آتی اور پھر دوستوں کے ساتھ سیر سپاٹے کے لیے باہر چلی جاتی۔ بے شک مجھے کسی ایک لڑکے سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی تاہم میں لڑکوں میں خاصی مقبول تھی اور کوئی نہ کوئی لڑکا مجھے ادھر ادھر لے جانے کیلئے ہمیشہ تیار نظر آتا تھا۔ میں آدھی آدھی رات تک دوستوں کے ساتھ قہوہ خانوں کے چکر لگاتی رہتی۔ میری یہ بداعتدالیاں یوریکو کو بے حد پریشان کر دیتی تھیں۔ وہ اکثر مجھے دھمکاتی یا پیار سے سمجھاتی اور اس طرزِ عمل سے کنارہ کشی کرنے کو کہتی مگر میرے کان پر جوں تک نہ رینگتی۔

دراصل ان دنوں میں ایسے شخص کی مانند تھی جو نہ صرف قوتِ احساس اور سوچنے کی صلاحیت سے عاری ہو بلکہ روح

تک سے محروم ہو چکا ہو۔ والدہ کی یکایک موت نے میری سوچ سمجھ کو گویا سُن کر کے رکھ دیا تھا اور میں یہ الٹی سیدھی حرکتیں اس لئے کرتی پھر رہی تھی کہ اُن کی موت کے المیے کو فراموش کر سکوں۔ ویسے اس وقت میں کسی اور کے سامنے تو درکنار، اپنی ذات کے سامنے بھی اس حقیقت کو تسلیم کرنے کو تیار نہ تھی کہ میں اپنا غم غلط کرنے کے لئے یہ سب کچھ کر رہی ہوں بہرحال اس سلسلے میں میری تمام مساعی ناکام رہیں اور مہینوں بعد بھی غم میرے دل کو اسی تیزی سے چھلنی کر رہا تھا جیسے اس صبح کے وقت جبکہ میں نے بھاگتی ہوئی پہاڑی سے نیچے اُتر کر زمین پر بے حس پڑی والدہ کے پاس گھٹنے ٹیک دیئے تھے۔ ویسے میں عام اور نارمل زندگی بسر کرنے کی سر توڑ کوشش کر رہی تھی لیکن ماں کا خیال میرے دل سے جُدا نہ ہوتا تھا۔ میں سوچتی تھی کہ اُن کی رُوح کہاں ہو گی، کس حال میں ہو گی، آخر زندگی کیا ہے اور موت کیا ہے؟ یہ سوال اکثر میرے دماغ میں سر اٹھاتے رہتے، یہاں تک کہ دوستوں کے ساتھ سیر سپاٹا کرتے وقت بھی جب کبھی موقع ملتا میں سنجیدگی سے اُن سے اِن امور پر بات کرنے کی کوشش کرتی۔ وہ میری سوچوں پر حیران اور دنگ رہ جاتے اور انہیں پیش از وقت واویلا قرار دیتے۔ میں نے معلوم کیا کہ انہیں ایسی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ صرف خوش وقتی میں وقت گذارنا اور رقص و سرود اور لہو و لعب سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔ میں انکے

ساتھ ٹینس کھیلنے یا سکیٹنگ کرنے سے جان بوجھ کر اپنے آپکو تھکانے کی کوشش کرتی کہ تھک ہار کر گہری نیند سو سکوں بعض اوقات یہ طریقہ کارگر ہوتا لیکن اکثر اوقات ناکام ثابت ہوتا۔

رفتہ رفتہ میں نے سنجیدہ موضوعات پر دوستوں سے بات چیت کرنا بند کر دیا اور اپنے اساتذہ کی طرف رجوع کیا کہ اُن سے زندگی کے معانی کے متعلق معلومات حاصل کروں لیکن وہ سب بھی مجھے گول مول جواب سے ٹال دیتے تھے مثلاً وہ کہتے:

"ایسی باتوں کے متعلق غور و فکر کرنا تمہارے لئے اچھا نہیں۔ تم صرف اپنی پڑھائی کی فکر کرو تو تمہارے نمبر بہت اچھے ہو سکتے ہیں۔ تم زندگی اور موت کے مسئلوں کی گہرائیوں میں نہ پڑو۔ اِن مسائل کو بالائے طاق رکھ کر، صرف اپنے مضامین پر توجہ دو۔"

اساتذہ میں سے ایک جو دوسروں سے زیادہ میری مدد کے خواہاں تھے وہ بھی کوئی ایسا خیال پیش نہ کر سکے جو میرے دُکھی دِل کی تسکین کا باعث بن سکتا۔ انہوں نے بھی دوسروں کی طرح تلقین کرتے ہوئے کہا:

"یوشیکو، تم جیسی خوبرو لڑکی کے لئے ایسے مسائل سے اُلجھنا جن کو حل نہیں کیا جا سکتا سراسر حماقت ہے۔ دنیا کی عظیم ترین ہستیوں نے اِن امور سے گویا کنّی کی ہے اور منہ کی کھائی ہے۔ اِس لئے مناسب ہے کہ تم بھی اِن کو بھول جاؤ۔ اپنے آپ کو نئے مشاغل میں مشغول رکھو تاکہ ایسی باتوں کا خیال تک

تمہارے نزدیک نہ پھٹکے۔ اپنی زندگی کے ان سالوں کو جو قدرت کا عطیہ ہیں بھرپور طور پر گذارو۔ خوش رہا کرو۔"

میرے سارے اُستاد اِس قدر پُر اعتماد لہجے میں بات کرتے تھے اور اتنی جلدی یہ سب کہہ جاتے تھے کہ اُن سے باتیں کرتے ہوئے میں سمجھتی کہ ہاں وہ میری مدد کر رہے ہیں۔ غرض میں نے سب کی سنی۔ لیکن بعد ازاں مجھے یہ احساس ہُوا کہ انکی سوچ بھی اُسی قدر خالی ہے جس قدر میری اپنی سوچ و فکر۔ اگرچہ وہ میرے اُستاد تھے اور بیشتر اُمور میں بہت سمجھدار لیکن زندگی اور موت کے بارے میں مَیں اُن کی نصیحت پر عمل نہ کر سکی۔ مَیں سمجھتی تھی کہ ان کا حل ضرور موجود ہوگا اور مَیں نے فیصلہ کیا کہ مَیں ان کو معلوم کر کے رہونگی۔ کیونکہ اگر مَیں نے ایسا کر لیا تو شاید مَیں اپنی ٹوٹی پھوٹی زندگی کو جوڑ کر پھر سے زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جاؤں۔ لہٰذا میں نے اپنی مساعی جاری رکھیں۔

میرے اساتذہ میں سے ایک نے ایک دن مجھ سے کہا:

"تمہیں قدیم تصنیفات میں سے فلسفے کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔"

"جدید مصنفین کی تصانیف کا گہرا مطالعہ کرو۔" ایک دوسرے نے صلاح دی۔

"کیونکہ ماڈرن فلاسفر ہمارے لوگوں کے قدیم مذہبی عقائد کی پروا نہیں کرتے اور اس طرح حق اور سچائی کے زیادہ قریب ہیں۔"

اور مَیں نے یہ حماقت کی کہ دونوں ہی کی بات مان لی۔ حالانکہ

دونوں کے مشورات میں آسمان زمین کا فرق تھا۔ اور اگلے کئی ہفتے جاپان کے مشہور و معروف فلاسفروں کی کتب میں کھوئی رہی۔ ایک کتاب جو مجھے دوسروں سے زیادہ دلچسپ معلوم ہوئی وہ خودکشی کے متعلق تھی۔ یہ چھوٹی سی کتاب تھی اور جیب میں بھی ڈالی جا سکتی تھی اور اس کتاب میں خودکشی کے مسئلے پر حاصلِ بحث کی گئی تھی۔ مثلاً "وہ کونسا اندازِ فکر اور سوچ کا دھارا ہے جو لوگوں کو اپنی جان لینے پر مجبور کر دیتا ہے"؟ اس کتاب نے مجھ پر بڑا اثر کیا اور اس کو ختم کرنے کے بعد میں نے دیگر بہت سی ایسی کتابیں پڑھ ڈالیں جو اسی مضمون کے دیگر پہلوؤں پر روشنی ڈالتی تھیں۔ میں سچائی کو معلوم کرنے کی خواہاں تھی اور کسی ایسی تحریر و تصنیف کے ہاتھ لگنے کی تلاش میں تھی جو میرے سوالوں کا جواب دے سکے۔ بعض مصنفین نے بائبل کی تعلیمات میں سے چند اقتباسات بھی شامل کئے تھے لیکن بایں ہمہ وہ خود بھی مجھے حق کے متلاشی ہی معلوم ہوئے۔ قصہ کوتاہ یہ کہ میں نے یکے بعد دیگرے کئی کتب کا مطالعہ کر مارا کہ شاید کسی میں میرے سوالوں کا جواب موجود ہو کہ زندگی کیا ہے اور اس کا حاصل کیا۔ مگر میری اس ساری تگ و دو کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا، اور میرے شک و شبہات، میرے خدشات اور سوالات بدستور مجھے ستاتے رہے۔ میرے دل کو کوئی چین نہ تھا اور مجھے اپنی زندگی کا کوئی مقصد نظر نہ آتا تھا۔

اُن دنوں میں بارہا میں دل ہی دل میں کہتی کہ کاش میری والدہ

کے انکل زندہ ہوتے۔ گو ہمارا خاندان اُن سے کبھی مانوس نہ تھا تاہم میں نے ایک آدھ مرتبہ اُنہیں دیکھا تھا اور جب میں چھوٹی ہی تھی تو اُنہوں نے مجھے دو کتابیں بطور تحفہ دی تھیں جو مجھے بہت عزیز تھیں۔ والدہ کے یہ انکل ہمارے گھر سے قریباً دس میل دُور شہر میں خاصی دیر تک رومن کیتھولک پریسٹ رہے تھے۔ پھر انہوں نے نجانے کیوں راہبانہ زندگی چھوڑ کر شادی کر لی تھی۔

میں نہیں جانتی کہ وہ میری مدد کر سکتے تھے یا نہیں لیکن اکثر جب پریشانی کے عالم میں بستر پر لیٹی بار بار پہلو بدلتی تو میں تمنا کرتی کہ کاش میں اُن سے بات کر سکتی۔ اور اگر میں اپنے والد کی بات مانتی تو کسی سے مذہب کی بات کرنے کی ضرورت نہ سمجھتی کیونکہ اُن کے خیالات بھی میرے اساتذہ سے ملتے جلتے تھے۔ ان کے نزدیک مذہب کوئی حقیقت نہ رکھتا تھا اور سائنس اور انسان ہی سب کچھ تھے۔

اپنی نوعمری کے سالوں میں میں نے ڈائری لکھنا شروع کی جس میں میں اپنے دل کے اُن خیالات اور خواہشات کو تحریر کیا کرتی تھی جو میرے نزدیک بڑی اہمیت رکھتے تھے اور یہ عادت تاحال قائم تھی۔ لیکن اب اس میں یہ تبدیلی آئی کہ میں شعر کہنے لگی تھی لیکن میری شاعری بھی میری زندگی کی طرح اُداس خالی اور سکون کی تلاش میں سرگرداں نظر آتی تھی۔ مثلاً اُس میں اِس طرح کے خیالات قلمبند تھے:۔

یہ پنچھی، یہ پرندے کس قدر خوش قسمت ہیں۔
کتنے آزاد ہیں کہ جہاں چاہتے ہیں چلے جاتے ہیں۔
لیکن میں آزادی سے اپنے خیال کا اظہار تک نہیں کر سکتی۔
میں کیوں قید و بند میں ہوں۔ میں کیوں محبوس ہوں۔
مجھے کیوں وہ خوشی و شادمانی میسّر نہیں جو ان پرندوں کو حاصل ہے۔

میں کیوں اُن کی طرح زندگی سے محظوظ نہیں ہو سکتی"
میں اس وقت اس حقیقت سے بے خبر تھی کہ میں اُس راہ پر اتنی دور نکل آئی تھی جہاں سے واپسی ناممکن ہے۔ میری سوچیں میرے باطن ہی سے تعلق رکھتی تھیں، حتیٰ کہ میری دنیا میری ذات ہی کے گرد گھومنے لگی۔ اب مجھ پر عیاں ہو گیا کہ اس بے مقصد اور بدمزہ زندگی سے رہائی کا صرف ایک ہی طریقہ ہے لیکن میں اُس کے لئے تیار نہ تھی۔ صرف اس سوچ سے اندر ہی اندر گھلی جاتی تھی۔ میری راتوں کی نیند حرام ہو چکی تھی۔ جب میری سوچوں کا گورکھ دھندا میرے لئے بہت پیچیدہ ثابت ہُوا تو ایک دن میں نے اپنی ایک دوست سے اپنے ان خیالات کا ذکر کیا اور بے مقصد زندگی سے چھٹکارا حاصل کرنے کی خواہش کا بھی ذکر کر دیا۔ یہ ایک ایسی بات تھی جس کا ذکر میں نے تاحال کسی سے نہ کیا تھا اور میں نے اس پر اعتماد کر کے اس پر سب کچھ عیاں کر دیا جو پیشتر ازیں کسی پر نہ کیا تھا۔ لیکن اُس نے اُن باتوں کو اپنے تک محدود نہ رکھا اور کئی لوگوں سے اِس کا ذکر

کر دیا۔

اُس کے اِس طرزِ عمل پر میری مایوسی کی انتہا نہ رہی۔ مَیں سوچنے لگی کہ کوئی میرے خیالات کو نہیں سمجھتا اور کوئی میرا ہم خیال نہیں۔ اُدھر والد صاحب بھی میری شادی کا انتظام کرنے میں مصروف تھے۔ تاکہ جلد از جلد مجھ سے چھٹکارا حاصل کر لیں۔ مَیں نے اپنی سہیلی پر اِس لئے اعتبار کیا تھا کہ وہ مجھے تسلی دے سکے گی مگر اُس نے یہ کہہ کر کھلایا کہ ہر ایک پر میرے راز کو افشاں کر دیا۔ ایسی زندگی کا کیا فائدہ! اور مَیں نے تہیہ کر لیا کہ اپنے غم و اندوہ کو ختم کر کے ہی دم لوں گی۔ یہ خیال کئی دنوں سے میرے دماغ میں تشکیل پا رہا تھا۔ میری دوست کی ناسمجھی کے اِس اقدام نے گویا جلتی پر تیل کا کام کیا۔

مَیں نے ساحلِ سمندر پر جانے کا پروگرام بنایا اور خیال کیا کہ وہاں پہنچ کر میں کنارے پر اپنا کوٹ اور اپنے جوتے رکھ دوں گی اور خود میں پانی میں چلتی جاؤں گی، اور اِس طرح چلتے چلتے بالآخر کوئی لہر مجھے اپنی آغوش میں لے کر ہمیشہ کی نیند سُلا دے گی جہاں پھر مجھے کوئی تکلیف نہ ہو گی اور نہ کوئی خیال ستا سکیگا۔

فروری کا مہینہ تھا۔ رات بھیگ چکی تھی اور مَیں اپنی مذکورہ بالا اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے ٹرین میں سوار تھی۔ مَیں سوچ رہی تھی کہ ہم جلد ہی ٹوکیو کے اُس مشہور تفریحی مرکز پر پہنچ جائیں گے جو میری پیدائش سے پیشتر سے سارے ٹوکیو کے لئے تفریح مہیا کرتا رہا ہے۔ خاصی دیر ہو چکی تھی لیکن ٹرین بدستور

پوری رفتار پر اڑی چلی جا رہی تھی۔ میرے تن بدن میں ایک عجیب سی بے کلی کی لہر دوڑ رہی تھی۔ دل میں ایک گھبراہٹ تھی جس سے میں خود سراسیمہ ہوئی جاتی تھی۔ میں نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر نگاہ ڈالی لیکن بوکھلاہٹ میں سوئیوں کی گردش مجھے وقت تک نہ بتا سکی۔ تب میں نے باہر جھانک کر کسی مانوس عمارت کی شناخت کرنے کی سعی کی مگر ناکام رہی۔ میں کوئی ایسی شے یا جگہ نہ دیکھ سکی جسکی میں پہچان کر سکتی۔ گھبراہٹ کی شدت سے مجھے متلی سی ہونے لگی میرا کلیجہ منہ کو چلا آتا تھا اور میرے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا کیونکہ اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میں پھر وہی غلطی کر چکی ہوں یعنی یہ کہ غلط ٹرین میں سوار ہو چکی ہوں۔

میں یہ بات سمجھنے سے قاصر تھی کہ ایسا کیونکر ہوا! میں ٹوکیو کلاں میں بڑھی پلی تھی اور وہاں کے ٹرانسٹ سسٹم سے اس طرح واقف تھی جس طرح اپنے گھر کے آس پڑوس کی گلیوں سے۔ تاہم اس شب میں ایک یا دو مرتبہ نہیں، تیسری یا چوتھی مرتبہ غلط ٹرین میں بیٹھ گئی تھی۔ اور اب ٹرین میں تن تنہا بیٹھی یہ سوچ رہی تھی کہ اس منحوس شام میں نے ٹرین میں کتنی مرتبہ سواری کی تھی، اور کتنی مرتبہ بعد میں احساس کیا تھا کہ غلط ٹرین پکڑ چکی ہوں اور اب بھی غلط ٹرین میں بیٹھی ہوں! آخر میری سمجھ کو کیا ہو گیا تھا؟

میں مڑ کر دوبارہ اپنے سامنے خالی سیٹوں اور بند دروازوں کو گھورنے لگی۔ سب کچھ گڑبڑ اور گڈمڈ ہو کر صرف تین چیزوں پر آ کر ختم ہو گیا تھا:

"کھڑ۔ کھڑ کرتی ٹرین، میری اپنی ذات اور میری تنہائی"
مجھے یوں محسوس ہونے لگا گویا میں زندگی کا بیشتر حصّہ ٹرین ہی میں سفر کرتی رہی ہوں اور اسی طرح سفر کرتے کرتے اگلے جہاں پہنچ جاؤں گی۔

مجھے بخوبی یاد ہے کہ میں نے اُس منحوس شام کو ریوے ٹرمینل پر واپس پہنچ کر ریلوے ٹائم ٹیبل کو احتیاط سے دوبارہ پڑھا حالانکہ عام حالات میں اس کی ضرورت نہ ہوتی کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ مجھے کونسی ٹرین پر سوار ہونا چاہیئے کیونکہ اپنے بھلے دنوں میں میں نے بارہا اُس پر سواری کی تھی۔ لیکن آج مجھے اپنے حافظے پر بھی اعتبار نہ رہا تھا۔ نجانے میرے مزاج یا میری طبیعت میں کونسی چیز تھی جو مجھ سے غلط ملط حرکات کروا رہی تھی۔ میں تفریحی مرکز تک پہنچنا بخوبی جانتی تھی لیکن اس کے باوجود بھی میں ایک دفعہ پھر غلط ٹرین میں سوار تھی۔ اور پھر میں اس قدر بوکھلا گئی کہ مجھے کچھ واضح علم نہیں کہ اس کے بعد کیا ہوا۔ صرف خدا ہی جانتا ہے جس کی نظر اُن ہولناک گھنٹوں میں میری ہر حرکت پر مبذول اور مرکوز رہی تھی۔

دراصل میری پریشانی کی بھی ایک معقول وجہ تھی، لیکن اس وقت میں اُس سے بے خبر تھی، اور اگر باخبر ہوتی بھی تو سمجھ نہ پاتی۔ مجھے بعد ازاں معلوم ہوا کہ ساحل سمندر کی طرف جاتے ہوئے راستے میں میں ایونجیلیکل چرچ تھا جس کے بزرگ پاسٹر صاحب نہایت ہی رحمدل اور مہربان تھے۔ اور جب دو سال پیشتر ایک نوجوان نے وہاں سے قریب اسٹیشن پر سے کود کر خودکشی کی تھی تو اس ضعیف

پاسٹر کی نحیف جان اس واقعہ سے بہت ہلکان ہوئی تھی کہ اُن کے چرچ کے قریب کوئی جوان مایوسی کا شکار ہو کر خودکشی کا مرتکب ہُوا ہو۔ لہٰذا اس کے بعد سے وہ ہر روز اُن سب کے لئے دُعا میں خدا سے التجا کرتے تھے کہ خدا انہیں جو خودکشی کے ارادے سے اس اسٹیشن پر آئیں اس مذموم ارادے سے باز رکھے اور خداوند یسوع مسیح کے شفا اور نجات بخش علم تک پہنچائے۔ میں اُس گھڑی اس امر سے قطعی ناواقف تھی کہ میں اس وقت بھی خدا کے محافظ ہاتھ میں تھی اور اگر اس حقیقت سے آشنا بھی ہوتی تو غالباً اس کا تمسخر اڑاتی۔

"یونیکو" تب میں نے خود ہی اپنے آپ کو زیرِ لب پکارا کیونکہ مجھے خیال گذرا کہ کہیں میں اپنا نام ہی نہ بھول جاؤں۔ یہی نام تو حقیقی دنیا سے میرا واحد رابطہ رہ گیا تھا۔ یہ نام جونانی اماں نے میرے لئے اس تمنا کے ساتھ تجویز کیا تھا کہ تا عمر میری خوب دیکھ بھال کی جائے گی اور اٹھاسی سال کی عمر تک بھلی چنگی رہونگی۔

میں سوچ رہی تھی کہ جہاں تک میرے نام کے معنی یعنی "خوشی کی بیٹی" کا تعلق تھا تو نانی اماں کی تمنا کا پہلا حصّہ تو پورا ہو چکا تھا۔ میرا بچپن خوشی میں گذرا تھا اور اب بھی میرے والد نے مجھے خوش رکھنے میں کوئی کسر باقی اٹھا نہ رکھی تھی۔ بلکہ انہوں نے اپنی محبوب بیوی کی وفات کے غم کو پسِ پشت ڈال دیا تا کہ اس طرح مجھے خوش کر سکیں وہ آئے دن میرے لئے نت نیا تحفہ لاتے تھے، ایسا تحفہ جو خاصہ قیمتی ہو اور جس کی میں قدر کر سکوں۔ آہ میرے والد نے

گویا میرے لئے خوشی اور مسرّت کو خرید کر میرے قدموں میں ڈالنا چاہا تھا، مگر یہ ساری کوشش رائیگاں ثابت ہوئی اور میں کوئی دیرپا تسکین حاصل نہ کر سکی اور میری زندگی بدستور خالی اور بے مقصد رہی۔ لیکن نانی اماں کی دوسری خواہش جو درازیِ عمر کی تھی اس کے تو خیال ہی سے اب مجھے وحشت ہونے لگتی تھی بلکہ مجھے اُن ایام میں یوں معلوم ہونے لگا تھا گویا ان کی یہ دعا اور تمنا ایک بھاری پتھر ہو جو میرے گلے کے گرد لٹکا دیا گیا ہو۔ بھلا ایسے میں اٹھاسی سال کی طویل عمر تک کون جی سکتا ہے؟ میں جھنجھلا کر اپنے سے سوال کرتی۔ کیونکہ مجھ پر اپنی زندگی کا اِک اِک دن بھاری تھا۔

اب میں نے بیدلی سے نگاہیں اُٹھا کر سامنے دیکھا تو کنڈکٹر کے علاوہ صرف ایک شخص جو مجھے نظر آ رہا تھا وہ مقامی تفریحی مرکز کے لئے سیزن کی ٹکٹ رکھنے والا تھا۔ اُس کی تھکی ہوئی آنکھیں بند تھیں۔ غالباً ٹرین کی مدھم روشنی بھی اُن پر گراں گذر رہی تھی۔ جب ٹرین ایک اور سٹیشن پر ٹھہری تو اس کے جسم میں جنبش ہوئی اور مجھے احساس ہُوا کہ وہ سویا ہُوا نہیں تھا بلکہ یونہی لیٹا ہُوا تھا۔

تب میں گھبرا کر یہ سوچنے لگی کہ تھوڑی دیر پہلے جو میں نے اپنا نام لیا تھا کیا اُس نے سن لیا تھا؟ اور اگر سن لیا تھا تو وہ کیا سوچ رہا ہوگا۔ غالباً اس نے چلتی گاڑی کے شور میں میرا نام نہیں سُنا ہوگا۔ لیکن اس وقت میں اس خیال سے اپنی جان ہلکان کر رہی تھی۔

اب وہ مرد مجھے سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اُس کی نظریں میرے چہرے کے متناسب خدوخال سے ہٹ کر ان سکیٹس پر پڑیں جو میرے کندھوں پر آویزاں تھے۔ اور میں جان گئی کہ وہ کیا سوچ رہا ہے کیونکہ میرے جیسی بیشتر لڑکیوں کے پاس عموماً اتنا عمدہ کوٹ یا اتنے قیمتی سکیٹس نہیں ہوتے تھے جو میرے پاس تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ایسی اشیا کے لئے میرے پاس کہاں سے پیسہ آیا ہوگا اور یہ کہ کیا میں شریف لڑکی ہو سکتی ہوں جو اتنی رات گئے باہر پھر رہی تھی؟

میرے دل میں زبردست خواہش پیدا ہوئی کہ چلا کر اُس سے کہہ دوں کہ میرے والد صاحب نے میرا غم غلط کرنے کو مجھے خرید کر دیئے ہیں اور میں اس لئے اس وقت تک اپنے گھر سے باہر ہوں کہ ماں کے بغیر مجھے گھر کے در و دیوار گویا کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔ بلکہ اُس وقت تک میرے باہر ہونے کی صحیح وجہ یہ ہے کہ میں صحیح ٹرین میں سوار نہ ہو سکی تھی۔ لیکن پھر جلد ہی میں نے سوچا کہ "پگلی تو نیکو تمہیں اسے یہ سب کچھ بتانے کی آخر کیا ضرورت ہے۔ تم اپنی مرضی کی مالک ہو۔ وہ کون ہوتا ہے کچھ سوچنے یا اعتراض کرنے والا"

پھر اچانک میری سوچ کا سلسلہ منقطع ہو گیا کیونکہ میرے کانوں میں یہ الفاظ پڑے۔

"کس اسٹیشن پر اتروگی؟"

تب میں نے دیکھا کہ وہ نہایت ہی لچر قسم کا میگزین پڑھ رہا تھا جو مرد لوگ اکثر ٹرین پر پڑھنے کو خرید لیتے ہیں مگر گھر نہیں لے

جاتے۔ اُس نے پھر اوپر نگاہ کر کے مجھے اچھی طرح دیکھا اور میں اُس کی شہوت بھری نظروں سے تلملا اُٹھی۔ میری روح کی گہرائیوں میں اسکے خلاف عتاب کا طوفان اُمڈ پڑا۔

"کس سٹیشن پر اترو گی"، اُس نے اپنا سوال دہرایا۔

مجھے یاد نہیں کہ میں نے اُس وقت اُسے کیا کہا تھا یا صرف قہر آلود نظروں سے گھورنے پر اکتفا کی تھی۔ صرف اتنا جانتی ہوں کہ ٹرین عین اُسی وقت کسی سٹیشن پر رُکی تھی اور میں ایکدم نیچے اتر کر خالی پلیٹ فارم پر کھڑی ہو گئی تھی۔ مجھ پر عجیب بدحواسی طاری تھی اور میں تن تنہا، بے کس اور بے بس کھڑی تھی۔ اب ٹرین کے آخری ڈبے کے عقب میں نصب لال بتیاں نظروں سے اوجھل ہو چکی تھیں۔ میں خوش تھی کہ کم از کم خوفناک آنکھوں والا آدمی تو دُور دفان ہُوا۔

اس کے بعد میں سنجیدگی سے یہ سوچنے لگی کہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ کیا میں پاگل ہوتی جا رہی ہوں؟ اگر میں نے اُس دن زیادہ "بیئر" پی ہوتی تو میں اپنی ساری بھول چوک کی اس کو ذمہ دار ٹھہراتی۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ اولاً ایسا نہیں تھا، پھر اگر پینے کا کوئی ایسا اثر ہوتا بھی تو اب تک سارا نشہ ہرن ہو جانا چاہیئے تھا۔

پھر میں نے صورتِ حال پر پھر سے غور کرنا شروع کیا۔ اور سوچنے لگی کہ اگر میں سمندر پر پہنچنا چاہتی ہوں تو مجھے دوبارہ گین ٹرمینل تک جا کر معلوم کرنا ہو گا کہ کونسی ٹرین پر سوار ہو کر ساحل سمندر تک پہنچوں۔ میں نے نوٹس بورڈ پر لگے ہوئے ریلوے

ٹائم ٹیبل کو بغور پڑھا اور معلوم کیا کہ مجھے اپنی ٹرین کے لئے خاصی دیر تک انتظار کرنا ہوگا۔ میں ہارے ہوئے جواری کی طرح پلیٹ فارم کے آخری کنارے پر جا کھڑی ہوئی۔ یخ بستہ موسم سرما کی سرد ہوا میرے جسم کے اندر سرائیت کرتی جا رہی تھی۔ نیچے شہر خواب خرگوش میں مدہوش نظر آ رہا تھا۔

"آہ! پھر سے سکون سے سونا کب نصیب ہوگا؟" میں نے کرب سے سوچا۔ "ہاں ایسی نیند جس میں ہولناک خواب نہ ہوں"۔

دن بھر کی افراتفری تاحال میرے سر پر سوار تھی اور میرے دماغ میں ہیجان سا برپا تھا۔ میں اس قدر گڑبڑا سی گئی تھی کہ ایک واقعے کو دوسرے سے علیحدہ نہ کر پا رہی تھی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میں آج تک اُس دن کے واقعات کو صفائی اور وضاحت سے یاد نہیں کر سکی۔ میرے دماغ میں اُس سہ پہر کا تصور کچھ اس طرح ابھرتا ہے:

"بحرِ بیکراں کی طرح ٹھاٹھیں مارتا ہُوا لوگوں کے سروں کا سمندر، ایسا ہجوم جس میں کھوے سے کھوا چھلتا تھا اور ریل گاڑیاں جو ہمیشہ میری منزلِ مقصود سے الٹی سمت میں جا رہی تھیں"

حالانکہ پیشتر ازیں ایسا کبھی نہ ہوا تھا۔ پہلی دفعہ غلط ٹرین میں بیٹھنے کے لئے تو میں اپنے آپکو معاف کر سکتی تھی کیونکہ میں اُس دن دفتروں سے گھر جانے والے ہجوم میں گویا جکڑی گئی تھی اور پھر اسی ہجوم کے ایک گروہ کے ریلے میں بے سوچے سمجھے کھچا کھچ بھرے

کمپارٹمنٹ میں جا بیٹھی تھی۔ دو یا تین اسٹیشنوں کے بعد مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا اور میں ٹرین سے اتر گئی تھی۔ نیز چونکہ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی اور ریل گاڑیاں چند منٹوں کے وقفوں سے آ جا رہی تھیں، اس لئے میں زیادہ فکر مند نہ تھی۔ تاہم چونکہ میرا دماغ گویا ماؤف ہو چکا تھا اس لئے میں فوراً فیصلہ نہ کر سکی تھی کہ مجھے فوراً ٹرمینل تک واپس پہنچنا چاہیئے۔ خیر اب میں پلیٹ فارم کے ساتھ لگی ریلنگ تک قدم مارتی چلی جا رہی تھی پھر اس سے ٹیک لگا کر ان گھروں اور گلیوں کو تکنے لگی جو اسٹیشن کے چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ بیشتر گھروں میں کم از کم ایک کمرے میں بتی جل رہی تھی اور ہر چوراہے پر سٹریٹ لائٹس چمک رہی تھیں لیکن سرما کی تابندہ چاندنی اُن کی چمک کو مات دے رہی تھی اور کچھ فاصلے پر کھڑی کسی کار کی چھت چاندی کی طرح جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔ پہلے تو میں اسے دیکھ کر چونک سی گئی تھی۔ پھر میں نے دیکھا کہ کار کی چھت چاند کی روشنی کو منعکس کر رہی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں اس بات سے حیران اور ششدر سی تھی کہ نیچے گلی میں لوگوں کی آمد و رفت کیوں ہے کیونکہ تب تک ٹیکسی چلانے والے بھی اپنے کاروبار کو صبح تک خیرباد کہہ چکے تھے۔

میں پلیٹ فارم سے ہٹ کر سیمنٹ کی بنی ہوئی سیڑھیوں پر چلتی ہوئی نیچے گلی میں اتر گئی۔ تب اسٹیشن پر سے ایک گاڑی آئی جو مین ٹرمینل کی طرف جا رہی تھی اور میرے دماغ میں دھندلا سا یہ خیال ابھرا کہ مجھے اس ٹرین پر سوار ہو جانا چاہیئے تھا لیکن پھر بھی مجھے خاص پریشانی نہ ہوئی۔ میں سوچ رہی تھی کہ کیا فرق پڑتا ہے کہ میں

کس وقت گھر پہنچوں اور اگر نہ پہنچوں تو پھر کیا ہے؟ کس کو میری پرواہ ہے"۔

مجھے والد کا خیال آیا۔ میں سوچتی تھی کہ وہ میرا ساتھ دیں گے مگر وہ بھی بڑے بھائی کے ساتھ مل کر میرے لئے معقول لڑکا تلاش کر رہے تھے اور میری ذمہ داری سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے۔ میری بڑی بہن یوریکو کی اس کی اپنی پسند کے لڑکے سے نسبت ٹھہرا دی گئی تھی اور میرے والد کو اس پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ لیکن میرا معاملہ فرق تھا۔ انہیں مجھ پر اعتبار نہ تھا، اس لئے وہ مجھے اپنی پسند کا لڑکا چننے کا حق دینا نہیں چاہتے تھے مبادا میں کسی ایسے شخص کو چن لوں جو میرے لئے ناخوشی اور خاندان کے لئے باعث ندامت ہو۔ وہ کہتے تھے کہ یونیکو جیسی غیر سنجیدہ اور کھلنڈری لڑکی بھلا کسی کے کردار کا صحیح جائزہ کیسے کر سکتی ہے! گو آج مجھے احساس ہے کہ میری شادی کے سلسلے میں والد کی مساعی سب اس لئے تھیں کہ میں والدہ کے غم کو بھلا سکوں، لیکن اس وقت میں انہیں اپنی ذات سے پلہ چھڑانے کا بندوبست اور ذریعہ جانتی تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ یہ سب لوگ مجھ سے اتنا نالاں کیوں ہیں؟ مجھ سے کیوں پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں؟ مجھے سب پر غصہ آرہا تھا حتیٰ کہ ماں پر بھی جس نے اتنی جلدی دنیا سے منہ موڑ کر مجھے مصائب کے جہنم میں جھونک دیا تھا۔ "آہ قدرت نے میرے لئے اتنی دماغی کوفت اور اذیت کیوں وقف کر دی تھی"؟ میں نے انتہائی کرب سے سوچا۔

اب میں گلی میں ایک طرف سے دوسری طرف اس طرح چلی جا رہی تھی جس طرح کوئی خواب میں چل رہا ہو۔ میں اپنے آپ کو قدم مارنے پر مجبور تو کر رہی تھی لیکن خود مجھے اپنی نقل و حرکت کا کوئی احساس نہ تھا۔ اس علاقے میں گھروں کے درمیان چند دکانیں تھیں۔ میں ان میں سے دو ایک پر ٹھہر کر وہاں رکھی ہوئی اشیا میں دلچسپی لینے کی کوشش کرنے لگی مگر بے سود۔ میرا دل بجھ کر پتھر ہو چکا تھا اور میری آنکھیں تو کھلی تھیں مگر میرا دماغ کام کرنے سے انکار کر رہا تھا۔

وہ احساسِ تنہائی جو ہفتوں سے مجھ پر مسلط ہو کر میرے دل کو مسل رہا تھا مجھ پر از سرِ نو ایک نئی شدت سے طاری ہو گیا۔ گویا اُس نے میری ساری سوچوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہو اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ یہ احساس گویا بڑا سا خوفناک ناگ ہو جو میرے وجود کے گرد کنڈلی مارے بیٹھا ہو۔ میں سوچ رہی تھی کہ اس بھری دنیا میں میں بالکل تنہا ہوں۔ کوئی میرا پرسانِ حال نہیں۔ کوئی میرا ہم خیال نہیں۔ میں بالکل اکیلی ہوں۔ ہاں کامل اور مکمل طور پر اکیلی اور تنہا۔

اب میری کلائی کی گھڑی کی سوئیاں رات کے بارہ بجنے کا اعلان کر رہی تھیں۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ سمندر کی طرف جانے والی آخری ٹرین بھی نکل چکی تھی اور میرے لئے گھر واپس جانے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔ اور پھر یکایک میرے دل میں جلد از جلد گھر پہنچنے کی شدید خواہش پیدا ہوئی۔ اور میرے دماغ پر

صرف ایک ہی دھن سوار ہو گئی۔
"مجھے گھر جانا چاہیئے! مجھے گھر جانا چاہیئے۔"
جلد گھر جانے کا خیال اور خواہش گویا میرے سارے وجود کو جھنجھوڑ رہی تھی اور میں یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ مجھے اچانک گھر کیوں یاد آنے لگا ہے کیونکہ گذشتہ کئی مہینوں سے میں اس گھر سے دور بھاگنے کی سعی کرتی رہی تھی۔ ہاں اس گھر سے جس کے چپے چپے سے میری ماں کی یادیں وابستہ تھیں۔ اور اب اس وقت مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میں ایک لمحہ اس گھر سے باہر نہیں گذار سکتی۔ لہٰذا میں نے جلد از جلد گھر پہنچنے کا فیصلہ کیا۔

اور تب کسی مشین کی طرح چلتے ہوئے دوبارہ جا کر ریلوے ٹائم ٹیبل پڑھا۔ رات کے اس پہر زیادہ ریل گاڑیاں نہ چلتی تھیں۔ مجھے اپنے گھر کی طرف لے جانے والی ٹرین کا تیس منٹ منٹ انتظار کرنا تھا۔ تیس منٹ! جبکہ ہر منٹ مجھ پر قیامت کی طرح بھاری تھا۔

سرد ہوا میرے رخساروں اور کانوں سے ٹکرا کر انہیں سُن کئے دیتی تھی۔ میں تیس منٹ کے طویل انتظار کے متعلق سوچتی ہوئی ویٹنگ روم کی طرف چل دی اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ دیکھا کہ اس کے پچھلے حصے میں متعدد بدمست مرد چند لڑکیوں کے ساتھ اٹھکیلیاں کر رہے ہیں۔ پہلے تو میں نے انہیں نظر انداز کرنے کی سعی کی لیکن

جلد ہی میں دوبارہ باہر نکل آئی۔ کمرے سے باہر آنے پر پہلے سے بھی زیادہ سردی کا احساس ہُوا۔ لیکن میرا دماغ اِس قدر چکرا رہا تھا کہ مجھے سردی کی قطعاً پرواہ نہ تھی۔

مَیں پلیٹ فارم کے آخری سرے تک گئی جہاں سے متعدد پکی سیڑھیاں نیچے ریل کی پٹڑی تک پہنچتی تھیں۔ مَیں تھوڑی دیر اردگرد کی دنیا مافیہا سے بے خبر اور بے نیاز وہاں ساکت کھڑی رہی۔ مجھے یاد نہیں کہ مَیں کتنی دیر اِس طرح کھڑی رہی یا اپنی مایوس کُن سوچوں میں غرق کب دوسری یا تیسری سیڑھی پر بیٹھ گئی۔ دراصل مجھے وثوق سے کچھ یاد نہیں کہ مَیں اُس دن کیا کرتی پھر رہی تھی۔ (بہت سی باتیں دوسرے لوگوں نے پولیس والوں کو بعد ازاں بتائی تھیں)۔

تھوڑی دیر بعد میری سوچیں پھر خودکشی کی طرف مبذول ہوئیں اور مَیں سوچنے لگی کہ اگر مَیں اپنی تجویز کو عملی جامہ پہناؤں تو کسی کو کوئی فرق نہ پڑیگا، بلکہ اِس طرح میرے خاندان کے باقی افراد کے لئے زندگی کسی قدر آسان ہو جائے گی۔ مثلاً میرے والد اور میرے بڑے بھائی کو میرے لئے بَر تلاش کرنے میں دوڑ دھوپ نہ کرنی پڑے گی۔ پوریکو میرا فکر کئے بغیر شادی کر سکے گی۔ اِس وقت مجھے یہ احساس نہ ہُوا کہ مَیں سراسر خود غرضی سے کام لے رہی ہوں بلکہ تب مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا گویا مَیں ایثار اور خود انکاری سے کام لے رہی ہوں اور جان کی قربانی دے کر خاندان کا بوجھ ہلکا کر رہی ہوں۔

اچانک میں خیالوں کے تانے بانے سے حقیقت کی دنیا میں

لوٹ آئی، کیونکہ کسی ٹرین کی آمد کا بآوازِ بلند اعلان کیا جا رہا تھا۔ مَیں نے اُسکے رکنے کا شور سُنا۔ دروازے کھلنے کی آواز آئی۔ لاؤڈ سپیکروں پر اُن اسٹیشنوں کے نام پکارے جا رہے تھے جن پر اُسے راستے میں رکنا تھا۔ مَیں نے آنکھ اٹھا کر اُوپر دیکھنے کی زحمت بھی نہ کی، اور اس کی کوئی ضرورت بھی نہ تھی۔ مجھے بخوبی علم تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ یعنی میں جانتی تھی کہ اب کنڈکٹر وسل بجانے سے پیشتر انجن کی طرف دیکھے گا پھر دروازے بند ہو جائیں گے اور ٹرین آگے کی طرف سرکنا شروع کر دے گی۔

تب مَیں اُٹھ کھڑی ہوئی۔ مَیں نہیں جانتی تھی کہ مَیں کیا کرنے لگی ہُوں۔ گاڑی حرکت میں آ چکی تھی۔ اس کی رفتار تیز ہوئی اور پھر اسی تیزی سے یک لخت میں اسکے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

پانچواں باب

یکایک مجھے ٹرین کی ایمرجنسی بریکوں کی چنگھاڑ اور بعد ازاں ایمبولنس کے سائرن کی بھیانک آواز سنائی دی۔ اور گویا کسی ہولناک خواب میں میں نے اپنے آپ کو چیختے اور یہ کہتے سُنا۔

"درد... ہائے... درد"

میں اس سے زیادہ اپنے آپ کو حادثے سے منسوب نہ کر سکی اور سوچنے لگی کہ ہائیں کون زخمی ہُوا ہے! عجیب بات ہے کہ میں اپنی آواز پہچاننے کے باوجود اس حقیقت سے بے خبر تھی کہ خود مجھے چوٹیں آئی ہیں اور معمولی نہیں بلکہ کاری!

مجھے بعد ازاں بتایا گیا کہ ریلوے کے دو کارکن اس ٹرین پر سوار اپنے کام پر جا رہے تھے اور ان کے پاس اپنے کام میں استعمال میں لانے کے لئے رسیاں تھیں۔ نیز یہ کہ وہ فرسٹ ایڈ یعنی ابتدائی طبی امداد بہم پہنچانے میں تربیت یافتہ تھے۔ لہٰذا جب حادثہ رونما ہُوا تو اس سے پیشتر کہ ٹرین رکتی وہ دروازہ کھول کر باہر کود پڑے اور انہوں نے ہی مجھے ٹرین کے پہیوں کے نیچے سے باہر نکالا اور ان رسیوں کو جو ان کے پاس تھیں خون بند

کرنے کے لئے باندھا۔ نیز انہوں نے ہی ایمبولنس کو طلب کیا۔ آج تک مجھے اُن کے ناموں کا علم نہیں لیکن ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ اپنی جان کے لئے میں اُن کی مرہون منت ہوں۔

خیر جب اِن گمنام محسنوں نے مجھے نزدیک کے یونیورسٹی ہسپتال میں پہنچایا اور جب مجھے قریب المرگ حالت میں ایمرجنسی وارڈ میں لے جایا گیا تو اس وقت پورے ہسپتال میں ایک ہی ڈاکٹر موجود تھا۔ یہ ڈاکٹر صاحب ایک عمر رسیدہ سرجن تھے جو اپنا بیشتر وقت میڈیکل کالج میں لیکچر دینے میں گذارتے تھے اور پورے جاپان میں بہترین سرجن کی حیثیت سے مشہور و معروف تھے۔ انہوں نے ایمرجنسی اپریشن کیا اور جن اعضا کو جسم سے علیحدہ کرنا اشد ضروری تھا علیحدہ کر دیا۔ اس کے علاوہ اس کے ساتھ ہی صدمہ سے بچاؤ کے لئے علاج شروع کر دیا۔

لیکن جب ہفتہ بعد میں ہوش میں آئی تو میں نے اپنی شومئی تقدیر کو خوب کوسا جس کے باعث میں اس قدر جسمانی اذیت اور ذہنی کوفت برداشت کرنے کے باوجود لوگوں کی انگشت نمائی کے لئے بچ گئی تھی۔ تب ہی نہیں بلکہ جب مجھے اپنی چوٹوں کا پورا علم ہوا تب بھی میں نے خوب واویلا کیا لیکن خدا نے میرے ناشکرے پن کے باوجود اپنا کام جاری رکھا۔ بہت سے امور ایسے ہیں جن کو میں اس وقت کی نسبت آج کہیں زیادہ بہتر طور پر سمجھتی ہوں۔ مثلاً یہ کہ خدا ہی نے ان دو کارکنوں کو اس ٹرین پر بٹھایا تاکہ وہ خود کشی کی سعی کے چند لمحوں بعد ہی طبی امداد

مہیا کر کے مجھے موت کے جبڑوں سے باہر نکال لائیں۔ شاید دنیا اسے حسن اتفاق کہے لیکن میں کہتی ہوں کہ خدا ہی مشہور اور ماہر سرجن کو اس ہسپتال میں لایا اور اسی نے اُسے وہاں روکے رکھا تاکہ جب ایمبولنس مجھے وہاں پہنچائے تو وہ میرا فوراً اپریشن کر سکیں۔

ویسے میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ خدا نے مجھ جیسی ناشکری اور نا اہل لڑکی کی اتنی پرواہ کیوں کی؟ یہ سوال ایسا ہے جسے میں بیسیوں مرتبہ پوچھ چکی ہوں اور جواب معلوم نہیں۔ لیکن آج اس کی اس حد درجہ نوازش اور کرم کے لئے شکرانے کا ہدیہ پیش کرتی ہوں اور ہمیشہ اسکی حمد سرا رہوں گی۔

تو وہاں ہسپتال میں داخل ہونے کے بعد ہفتہ بھر میں بے ہوش اور بے سدھ پڑی رہی۔ اس دوران میں جب کبھی تھوڑی دیر کو ہوش میں آتی تو مجھے یہ احساس ہوتا کہ ہسپتال میں پڑی ہوں اور اس امر کا بھی مجھے ہلکا سا احساس تھا کہ مجھے خون چڑھایا جا رہا ہے اور نلکیوں کے ذریعے خوراک بہم پہنچائی جا رہی ہے۔ اس کے بعد مجھے یہ احساس ہوا کہ میرا بایاں بازو کٹ چکا ہے اور نیز یہ کہ دائیں ہاتھ پہ بھاری سی پٹی بندھی ہے۔ پہلے پہل تو مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ میرا ہاتھ کتنا شدید زخمی ہے' اور پوڈریکو جو تمام وقت ہسپتال میں دیکھ بھال کرتی تھی اس بارے میں کچھ کہنا نہ چاہتی تھی۔

"تمہارا ہاتھ ٹھیک ہو رہا ہے" وہ کہا کرتی "غالباً کچھ

کہنے کی غرض سے کہتی۔
"لیکن اس پر اس قدر بھاری پٹی کیوں بندھی ہے"۔ میں اصرار کرتی رہی اور آخر ایک دن بادلِ نخواستہ اسے یہ کہنا پڑا۔
"غنیمت ہے کہ اس پر انگوٹھا اور دو انگلیاں موجود ہیں"۔
"انگوٹھا اور دو انگلیاں" جس کا مطلب یہ ہوا کہ دو انگلیاں صاف کٹ چکی تھیں۔ ہائے قسمت! کیا یہ کافی نہیں تھا کہ ایک بازو سرے سے کٹ چکا تھا؟ آہ یہ دوسرا بھی ناقص اور مسخ ہو گیا تھا! ایک نئی اذیت نے میری روح کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔
جب میں کسی قدر روبصحت ہوئی تو نجانے کیوں سب سے پہلے مجھے ان مشاغل کا خیال آیا جن میں اپنے دوستوں کے ساتھ شریک ہوا کرتی تھی۔ مثلاً ایک دن میں اپنا زخمی ہاتھ اوپر اٹھا کر آوازِ بلند بولی۔
"کم از کم میں سکیٹنگ کے لئے تو جا سکوں گی"۔
یہ سنتے ہی پورکیو کو گلے میں پھندا سا لگا اور وہ کمرے سے باہر بھاگ گئی گویا اسے متلی ہو رہی ہے۔ میں بوکھلا گئی کہ پورکیو کو بیٹھے بیٹھے یہ کیا ہوا کیونکہ تب تک مجھے اپنی ٹانگوں کا حال معلوم نہ تھا۔ کیونکہ میرے بستر کی پائینتی والے نصف حصے پر تنبو سا تنا ہوا تھا۔ اور جب میرے ڈاکٹر صاحب میرے زخموں کی مرہم پٹی کرتے تو میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی جاتی تھی۔
جب میری طبیعت کسی قدر سنبھلی تو پولیس کے چیف انسپکٹر

صاحب مجھے دیکھنے آئے۔ وہ مہربان طبع معلوم ہوتے تھے جنہیں اپنے کام کا یہ حصّہ خاصہ ناگوار معلوم ہوتا ہوگا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ سوالات کرنے کی بجائے میری مدد کرنے کے زیادہ خواہشمند ہیں۔

"کیا تم خوش نہیں ہو کہ تم جیتی جان ہو؟"

وہ میرے بستر کے پاس سٹول پر بیٹھتے ہوئے بولے اور میرا مُنہ تلخی سے ٹیڑھا ہوگیا۔ مَیں سمجھی تھی کہ وہ میرا مذاق اڑا رہے ہیں کہ مَیں اپنی جان لینے میں ناکام رہی تھی لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ یقیناً وہ مجھے بہلانے اور خوش کرنے کی غرض سے یہ کہہ رہے تھے۔ پھر انہوں نے مجھے اُن دو اشخاص کے متعلق بتایا جنہوں نے بہزار دِقت میری جان بچائی تھی۔

"تم خوش قسمت ہو۔ کیا تم خوش نہیں ہو کہ انہوں نے تمہیں بچا لیا؟" انہوں نے دوبارہ کہا

"اس میں خوش ہونے کی کیا بات ہے؟ انہوں نے مجھے میرے حال پر چھوڑ کیوں نہ دیا؟" مَیں نے تلخی سے جواب دیا۔

لیکن وہ میرے گستاخانہ اور تلخ رویے سے ذرّہ بھر جز بز نہ ہوئے اور بدستور شفقت سے پیش آتے رہے۔ مجھے یہ معلوم نہیں کہ وہ مجھ میں اس قدر دلچسپی کیوں لے رہے تھے۔ بارہا مجھے یہ خیال گذرا ہے کہ ممکن ہے انہیں خودکشی سے قریب کا واسطہ رہا ہو، یعنی اُن کے کسی چھوٹے بھائی یا بہن یا بیٹے بیٹی کو ایسی کوشش میں کامیابی ہوگئی ہو۔ یقیناً وہ

اپنے ماتحت کسی کارندے کو میری داستان کی تفاصیل سننے کے لئے بھیج سکتے تھے مگر وہ بذاتِ خود وہاں آئے۔ تھوڑی دیر بعد میں اُن سے کہہ رہی تھی :

"آپ کہتے ہیں کہ اُن کا شکریہ ادا کروں ؟ بھلا کس لئے ؟ میں ان پر تین حرف بھیجتی ہوں۔ کیا وہ اندھے تھے جو یہ نہ دیکھ سکے کہ میں دانستہ ایسا کر رہی ہوں اور اپنی تجاویز میں کسی احمق کی مداخلت کی خواہاں نہیں ؟"

ہاں میں دل سے اس بات کی قائل تھی کہ میرے مسئلے کا واحد حل موت اور فقط موت تھی۔ اور یہ لوگ جھوٹ موٹ یہ کیوں ظاہر کر رہے تھے کہ میری مشکلات ختم ہو چکی ہیں۔ نیز یہ کہ زندگی پھر پرلطف اور پُرکشش ہو سکتی ہے۔ ہائے یہ سب مجھے اکیلا کیوں نہیں چھوڑ دیتے ؟ آخر ہر شخص کو یہ حق حاصل ہونا چاہیئے کہ وہ فیصلہ کر سکے کہ آیا وہ زندہ رہنا چاہتا ہے یا نہیں ؟ یہ لوگ دخل اندازی کر کے مجھے دوبارہ وہی کرنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ غرض میری سوچوں کا دھارا کچھ اسی سمت میں بہہ رہا تھا۔

پور یکو رات دن میرے کمرے میں موجود رہتی تھی، اور بڑا بھائی اور اس کی بیوی اور میرا چھوٹا بھائی اکثر ہسپتال میں مجھے ملنے آتے تھے لیکن ابھی تک میرے والد ایک دفعہ بھی مجھے دیکھنے نہ آئے تھے۔ میں اُن کے نہ آنے کے متعلق سوچتی اور بھائیوں سے انکے بارے میں پوچھتی تو وہ یہ کہہ کر ٹال دیتے کہ اُن کی طبیعت کسی قدر ناساز ہے یا ان کے دفتر میں کام کی بھرمار ہے۔

ہُوا یوں کہ ایک دن میں اُن کے نہ آنے کا گلہ کر رہی تھی کہ پورنیکو جو دیر سے چپ چاپ بیٹھی سب کچھ سن رہی تھی یکدم بول اُٹھی :

"ہم نے اس کے متعلق بات کی تھی مگر بھیّا کا کہنا تھا کہ میں تم سے کچھ نہ کہوں۔ لیکن یونیکو میں نہیں چاہتی کہ تم یہ سوچو کہ والد تمہاری پرواہ نہیں کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تمہیں اس قدر عزیز رکھتے ہیں کہ تمہیں اس حالت میں دیکھنا انکے بس کی بات نہیں۔"

اُس نے بے بسی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اب وہ کہہ رہی تھی :

جس دن پولیس والوں نے اِس منحوس واقعے کی اطلاع انہیں دی وہ ساری رات اپنے کمرے میں بے چینی سے ٹہلتے رہے اور پل بھر کو سو نہ سکے اور وہ بار بار یہ کہہ رہے تھے :

"یونیکو کیوں اپنی جان لینا چاہتی تھی ؟ کیوں ؟ آخر کیوں ؟ میں کِس طرح اُس کی مدد کر سکتا ہوں ؟ میں نے ہر حربہ آزمانے کی کوشش کی ہے ؟"

تب مجھے اُن کے نہ آنے کی اصل وجہ معلوم ہوئی اور میرا جی چاہا کہ پھوٹ پھوٹ کر روؤں۔ مجھے اپنے اوپر ندامت محسوس ہو رہی تھی۔ میں سوچا کرتی تھی کہ میں والد کو اچھی طرح جانتی ہوں یعنی یہ کہ وہ خاموش طبع، کم گو اور قدامت پسند انسان تھے اور میری ماں کی موت کے بعد خاصے بدل گئے تھے۔ بعض لوگ شاید یہ کہیں کہ اُن کا ہسپتال نہ آنا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ حقیقت کا سامنا

نہ کرنا چاہتے تھے لیکن جہاں تک میری سوزش کا تعلق ہے۔ مجھے پوریکو کی باتوں سے یہ جان کر خوشی ہوتی تھی کہ والد مجھے پیار کرتے ہیں۔ لیکن میری عادتیں کچھ بگڑی ہوئی تھیں اور چونکہ والدہ میری ہر خواہش کو پورا کرنا اپنا فرض منصبی خیال کرتی تھیں اور میرے لئے کھانا بھی میری عین پسند کے مطابق بناتی تھیں لہٰذا ہسپتال میں بھی میں ہر چیز اپنی پسند کی طلب کرتی تھی۔ اور طرہ یہ کہ ہسپتال میں مجھے اُن ایام میں صرف اُن ہی سبزیوں یا پھلوں کے لئے رغبت محسوس ہوتی تھی جن کا اس وقت موسم نہیں تھا۔ مجھے یاد ہے کہ کچھ عرصے تک مجھے مالٹوں کے علاوہ کھانے کی کوئی شے نہ بھاتی تھی۔ اس کے بعد میں نے تربوز کی فرمائش کی۔ اور مجھے یہ معلوم نہیں کہ انہوں نے موسم سرما کے عین درمیان میں تربوز کس طرح اور کس قیمت پر حاصل کیا کیونکہ اس سے پیشتر میں نے فروری کے آخر میں کبھی تربوز نہیں دیکھا تھا۔ یقیناً میرے گھر والوں نے اُس کے لئے منہ مانگی قیمت ادا کی ہوگی۔ بہرحال انہوں نے میری خاطر اسے کسی طور حاصل کیا اور مجھے پیش کیا۔ لیکن مجھے یہ یاد نہیں کہ میں نے اُن کی دوڑ دھوپ کے لئے تشکر کیا یا قدردانی کا اظہار کیا تھا یا نہیں۔

ہاں تو ہسپتال میں میرے قیام کے پہلے ایام میں وہ مجھے نیند آور گولیاں سے سلائے رکھتے تھے۔ میری آنکھیں ہر وقت خمار آلود رہتیں اور میرا دماغ اس قدر دھندلا سا گیا تھا کہ مجھے یہ بھی یاد رکھنا مشکل معلوم ہوتا تھا کہ کون آیا اور کون گیا۔ اس پر ڈاکٹر

صاحب کو تشویش ہونے لگی اور انہوں نے مجھ سے کہا۔
"یو ریکو تمہیں سارا وقت سوتے نہیں رہنا چاہیئے۔ ذرا اُٹھ کر بیٹھو اور بیدار رہنے کی کوشش کرو۔"
میں نے بمشکل آنکھیں کھول کر ڈاکٹر کو دھندلائی سی نظروں سے دیکھا اور زیر لب بولی۔ "مجھے بہت نیند آرہی ہے... میں بیدار نہیں رہ سکتی۔"
پھر وہ مجھے اٹھا کر تکیوں کے سہارے بٹھاتے تاکہ یوں بیٹھنے سے میرے جلدی اونگھ جانے کا امکان نہ ہو۔ مگر جب وہ ایسا کرتے تو میرے سر کو چکر آنے لگتے اور مجھے یوں لگتا گویا میرے گرد ہر شئے دائرے کی شکل میں گھومتی جا رہی ہو۔ دراصل میں صرف خاموش لیٹ کر سوئے رہنا چاہتی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ میری طبیعت پر نیند اور خمار کا غلبہ صرف اِس لیئے نہیں تھا کہ مجھے اس قسم کی دوائیں مل رہی تھیں بلکہ اِس میں بہت حد تک میری اپنی مرضی کا بھی دخل تھا۔ کیونکہ سوئے رہنے سے میں سوچنے کی زحمت سے بچ جاتی تھی ورنہ میں اپنے غیر موجود بازو اور کٹے ہاتھ کا سوچنے لگتی اور سوچتی کہ میری اسکیم ناکام کیوں رہی تھی۔ ویسے تاحال مجھے اپنی ٹانگوں کے بارے میں علم نہ تھا۔ یہ دھماکا ابھی ہونے والا تھا۔
مجھے یاد ہے کہ ایک دن میں نے یوریکو سے کہا
"یوریکو میرے پاؤں کے انگوٹھے پر کھجلی ہو رہی ہے۔"
یہ سنتے ہی یوریکو کے چہرے پر خوف کی لہر دوڑ گئی اور لمحہ بھر

کہ وہ مجھے اپنی عمر رسیدہ نظر آئی جتنی میری والدہ اپنی وفات کے وقت تھیں۔

"ذرا کھجا دو نا"

اس پر پوریکو بے بسی سے اُٹھی اور میرے پلنگ کی پائینتی پر لگے تنبو کے نیچے ہاتھ ڈال کر اُس نے یوں ظاہر کیا گویا میرے پاؤں کو کھجا رہی ہو۔

"کہاں کھجا رہی ہو۔ مجھے ذرا بھی محسوس نہیں ہُوا۔ ذرا اور زور سے کھجاؤ"

یہ کہتے ہوئے مجھے غصّہ اور اُس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے اور میں ششدر رہ گئی کہ پاؤں کھجانے میں بھلا رونے کی کیا ضرورت تھی۔

آخر وہ دن بھی آ پہنچا جب انہوں نے میرے پلنگ کی پائینتی کی جانب سے تنبو جیسی شے کو اُتار دیا اور ڈاکٹر نے مجھے بستر سے اُٹھنے کے لئے کہا۔ یہ سنتے ہی پوریکو خوفزدہ ہو کر بولی "ڈاکٹر صاحب، کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ اٹھنے کے لئے تیار ہے"

"ہاں بالکل"، وہ کسی قدر خوش اور فیصلہ کن لہجے میں بولے۔

یہ کہہ کر وہ کمرے میں کھڑے میرے اُٹھنے کا انتظار کرنے لگے۔ لیکن یاد رہے کہ میں اس محتاجی کی حالت میں بھی تا حال خود مختار طبع کی مالک تھی۔ مجھے ڈاکٹر صاحب کا حاکمانہ لہجہ پسند نہ آیا تھا اور میں اُٹھنے پر آمادہ نہ تھی۔ میں ابھی تک وہی کام کرتی تھی جس کو کرنے کی خود میری رضا ہوتی تھی۔ غرض میں جوں کی توں لیٹی ہوئی

تھی اور ڈاکٹر صاحب تا حال وہیں کھڑے تھے۔ پھر اُن کے رویّے سے یوں ظاہر ہوا گویا وہ مجھے اُٹھ کر بیٹھنے کا آرڈر (حکم) دینے والے ہیں۔ لیکن پھر ایکا ایکی انہوں نے اپنا ارادہ بدل ڈالا اور الفاظ ان کی زبان پر آتے آتے رہ گئے۔ وہ اپنا رُخ بدل کر پوریکو کو مخاطب کرتے ہوئے بولے:

"اگر تمہیں میری مدد کی ضرورت ہو تو میں لاؤنج میں ہونگا۔"

مجھے اپنے نظر انداز کئے جانے پر غصہ آ گیا۔ اور میرا کٹا پٹا جسم غصے سے اینٹھ گیا۔ میں سوچ رہی تھی کہ "بستر پر اُٹھ تو میں رہی ہوں اور بقول ڈاکٹر مدد کی ضرورت پوریکو کو ہوگی۔ کیا کہنے۔ ویسے جلد ہی مجھے پوریکو یا کسی دوسرے کی مدد کی چنداں ضرورت نہ ہوگی۔" اُس وقت تک میں اپنی بدبختی کی وسعت کو نہ جانتی تھی نہ یہ کہ میرے کون کون سے اعضا علیٰحدہ کر دیے گئے ہیں۔ ویسے اب تک مجھے یہ احساس ہونے لگا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے اور میرے متعلق کوئی پریشانی کی بات ضرور ہے۔ میرا منہ گرم اور خشک ہو گیا اور دل پر خوف طاری ہو گیا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کے چلے جانے کے بعد میں نے پوریکو کو غصے سے دیکھا اور اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔

"ٹھہرو۔ میں تمہاری مدد کرتی ہوں"، پوریکو پکار کر بولی۔

"مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں"، میں نے ترشروئی سے جواب دیا۔

اور پھر یک لخت میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں بستر سے اُٹھنے

کی کوشش تک نہ کروں گی۔ یہ ڈاکٹر صاحب کون ہوتے ہیں مجھے یوں حکم دینے والے؟" یہ سوچ کر ہیں لمبے لمبے سانس لیتی ہوئی پلنگ کی ٹیک کے ساتھ رکھے ہوئے تکیوں پر پیچھے کو ٹھپ سے جا لگی۔ لیکن پھر جلد ہی مجھے خیال آیا کہ "بیڈ پین استعمال کرتے وقت مجھے کتنی دقّت ہوتی ہے اور اس ساری کارروائی سے مجھے کس قدر نفرت ہے۔ اگر میں آج صرف پلنگ کے کنارے بیٹھنے کی کوشش کروں تو جلد ہی چل کر باتھ روم جا سکوں گی اور دوسروں کی مدد سے بے نیاز ہو جاؤں گی۔ اور یہ کتنا اچھا ہوگا۔" یہ سوچتے ہی پلنگ پر ہلنے جلنے اور اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ یوریکو میری مدد کرنا چاہتی تھی لیکن میں نے اسے دھکا کر پیچھے کر دیا اور جوں توں کر کے بستر پر بیٹھا گئی اور ایک بازو کا سہارا لے کر پلنگ کی پٹی کے قریب سیدھی ہو گئی۔ لیکن جونہی میں نے آگے بڑھنا شروع کیا تو اپنے آپ کو روک نہ سکی اور یکایک لڑھک کر گھٹنوں کے بل دھم سے نیچے آن پڑی۔

کوئی نارمل شخص تو اپنے آپ کو گرنے سے بچا سکتا تھا لیکن میں ایسا نہ کر سکی اور مجھ پر ساری حقیقت حال عیاں ہو گئی کہ نہ صرف میرا ایک بازو اور دوسرے ہاتھ کی دو انگلیاں کٹ چکی ہیں بلکہ میری دونوں ٹانگیں ندارد تھیں۔ میں بے کس اور بے بس اپاہج ہو چکی تھی۔ میں فرطِ یاس اور دکھ درد کی شدت سے بلبلا اٹھی اور جہاں گری تھی وہیں پڑی رہی۔ میں نے وہاں سے حرکت کرنے کی کوشش تک نہ کی۔ بلکہ وہیں پڑے پڑے

زار و قطار روتی رہی۔ ہسپتال کے بالعموم خاموش ہال میں میری آواز گونج رہی تھی۔ مگر مجھے کوئی پرواہ نہ تھی کہ مجھے کون دیکھتا ہے یا اس آہ و بکا کو کون سنتا ہے۔ سارے بند ٹوٹ گئے تھے۔

پورٹیکو ضرور کسی کو مدد کے لئے بلانے کے لئے باہر بھاگ گئی ہوگی۔ کیونکہ جلد ہی ڈاکٹر صاحب ایک نرس کے ساتھ بھاگم بھاگ میرے کمرے میں داخل ہوئے اور انہوں نے مجھے اُٹھ کر دوبارہ بستر پر لٹا دیا۔ پھر نیند آور ٹیکے کے اثر سے میری پلکیں بوجھل ہونے لگیں اور مہربان نیند نے مجھے اپنی آغوش میں لے کر سب کچھ بھلا دیا۔

اس انکشاف کے بعد کئی دنوں تک میں دیوار کی طرف مُنہ کئے اپنے پلنگ پر ساکت لیٹی رہی۔ میں نے بالکل چُپ سادھ لی تھی۔ یہاں تک کہ سوال کئے جانے پر بھی کسی کو جواب دینے کی بھی زحمت نہ کرتی۔ میں یاس و ہراس کے سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں غوطہ زن تھی اور سوچا کرتی تھی کہ آہ کیا سے کیا ہو گیا ہے۔ میں تندرست و توانا اور قبول صورت لڑکی سے گویا یکدم بے بس اپاہج عورت بن گئی ہوں۔ چند ہفتے پہلے مجھے اپنے والد اور بڑے بھائی سے یہ شکوہ تھا کہ وہ میری شادی کرنے میں اتنی جلدی سے کیوں کام لے رہے ہیں۔ اور آج میں تلخی سے یہ سوچ رہی تھی کہ خواہ وہ لاکھ کوشش ہی کیوں نہ کریں کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوگا۔ بھلا کوئی آدھی عورت سے شادی

کرنے پر بھی رضامند ہو سکتا ہے! اس حال میں میں بچوں کی دیکھ بھال تو درکنار، گھر کے لئے خریداری اور گھر کی صفائی بھی نہ کر سکوں گی۔ غرض میں نارمل زندگی بسر کرنے کا تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔ خاوند کی محبت، اور خاندانی زندگی کی مسرتوں کے دروازے مجھ پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو چکے تھے۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کے اندیشوں کے پیش نظر کسی خوشگوار مستقبل کا تصور کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ مجھے اپنی ساری مشکلات اور اپنے تمام تر مسائل کا صرف ایک ہی حل نظر آتا تھا کہ ایسی رینگ رینگ کر جینے والی زندگی کو اپنے ہاتھ سے جلد از جلد ختم کر ڈالوں۔ مگر اب کی مرتبہ میں بہت احتیاط سے کام لینا چاہتی تھی اور یہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی سر پھرا نیک نیت جو یہ نہ سمجھتا ہو کہ میرے لئے موت زندگی سے بدرجہا بہتر ہے میری اسکیم کو ناکام بنائے۔

لیکن گو میں نے منہ سے اس قسم کے خیالات کی بھاپ تک نہ نکالی تھی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب میرے خیالات کو بھانپ گئے اور انہوں نے بڑی سختی سے حکم دیا کہ میرے کمرے میں چاقو، چھری یا کوئی ایسی چیز نہ لائی جائے جس سے میں اپنی جان لے سکوں۔ غرض انہوں نے پھل کاٹنے کے لئے چھری بھیجنا بند کر دیا اور کمرے میں کوئی رسی دوڑی نہ رہنے دی بلکہ انہوں نے میرے کمونے کی بیلٹ (پیٹی) تک اتروالی تاکہ اس کے استعمال سے پھانسی لینے کی سبیل پیدا نہ ہو سکے۔

"تاہم میں اتنی جلدی ہار ماننے والی نہیں تھی۔ میں اُن کی کڑی نگرانی کے باوجود اپنی بیداری کا سارا وقت صرف یہ سوچنے میں صرف کر رہی تھی کہ اپنے ارادے کو کس طرح عملی جامہ پہناؤں۔ اور چونکہ اب تک مجھے وہاں رہتے خاصی مدت ہو چکی تھی میں ہسپتال کے روٹین سے خوب واقف ہو چکی تھی اور جانتی تھی کہ ان کی روٹین میں کیا خامی ہے یعنی کس وقت انہیں چکمہ دیا جا سکتا ہے اور میری دیکھ بھال کرنے والوں میں سے کون لوگ ایسے ہیں جو میری باتوں میں آ جائیں گے۔ لہٰذا میں نے جلد ہی اک سادہ سی تدبیر سوچ لی، اور اسکے مطابق میں نے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ نرسوں کے سامنا ہر شب یہ رونا رونے لگی کہ "میرے جسم میں شدید درد ہے ہائے میں ایک پل بھی سو نہیں سکتی"۔ نرسیں ڈاکٹر صاحب کو بلا لائیں تو میں نے ان کے سامنے درد اور نیند نہ آنے کا رونا رویا اور پھر بھولی سی صورت بنا کر کہا۔

"کیا آپ مجھے کوئی دوائی نہیں دے سکتے؟"

اس پر ڈاکٹر صاحب نے میرے لئے نیند آور گولیاں تجویز کیں جو ڈیوٹی والی نرسیں اپنی سمجھ سے فیصلہ کر کے مجھے بوقت ضرورت دے سکتی تھیں۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ مجھے اس سے زیادہ کیا چاہیئے تھا۔ اب ڈیوٹی والی نرس قریباً ہر رات مجھے گولی لا دیتی اور میں اس کی آنکھ بچا کر کھانے کی بجائے اسے چھپا کر رکھ دیتی۔ کبھی تکیے غلاف کے اندر اور کبھی تکیے کے نیچے گدّے کے تلے جہاں میں خیال کرتی کہ وہ نرسوں کی نظر سے بچی رہیں گی، اور ایسا کر کے

میں محسوس کرتی کہ میں نے بڑا معرکہ مار لیا ہے۔
اب تک میرے والد کو بھی اتنی ہمت ہو گئی تھی کہ گاہے گاہے مجھے ملنے آسکیں۔ ایک دن وہ آئے تو باتوں باتوں میں نے ان سے کہا کہ وہ مجھے اپنے شہر کے ہسپتال میں منتقل کروا دیں جہاں میں گھر کے نزدیک ہو سکوں۔ نجانے کیوں میرا جی چاہتا تھا کہ میں اس شہر میں دم توڑوں جہاں میں پلی بڑھی تھی اور جہاں میری والدہ نے وفات پائی تھی۔ میں اس وقت یہ نہیں جانتی تھی کہ خدا میری اس خواہش کو مجھے اپنے تک لانے کیلئے استعمال میں لائے گا کیونکہ یہی وہ شہر تھا جہاں ایکی توشی طہارا رہائش رکھتا تھا اور جو مجھے مذہب کی طرف مائل کرنے کا موجب بنا۔ لیکن جب میں نے والد سے اپنے شہر کے ہسپتال لے جانے کو کہا تھا تب مجھے مذہب کے نام ہی سے شدید نفرت تھی۔

چھٹا باب

تو ہاں میں ہر گولی لوہڑی کی سی مکاری اور عیاری سے بچا بچا کر چھپا چھپا کر رکھتی جا رہی تھی اور اپنے مہلک ذخیرے میں ہر نئے اضافے سے یہ سوچ کر خوشی محسوس کرتی تھی کہ کسی کو گمان بھی نہیں کہ میں کتنی عیار ہوں اور نئے ہسپتال میں آنے سے بھی اس کارروائی میں کوئی خاص فرق نہ پڑا تھا۔ یہاں بھی میں نے پہلے والا حربہ استعمال کیا یعنی یہ کہ میں نے معصوم سی صورت بنا کر ڈاکٹر سے کہا:

"مجھے شدید درد ہے جس کی وجہ سے میں رات کو ایک پل سو نہیں سکتی" اور انہوں نے جلد ہی نرسوں کو حکم دیا کہ بوقت ضرورت میرے طلب کرنے پر مجھے فلاں فلاں نیند آور گولی دیدیا کریں اور یوں میرا مطلب حل ہو گیا۔ اب سوتے جاگتے اپنے خودکشی کے خواب دیکھنا میرا مشغلہ بن گیا۔ مجھے یاد ہے کہ شب کو سونے سے پہلے میں دل ہی دل میں حساب لگاتی کہ مرنے کے لئے مجھے کل کتنی گولیاں درکار ہوں گی، کتنی گولیاں تاحال میرے پاس موجود ہیں اور کتنی مزید گولیوں کی ضرورت ہو گی وغیرہ۔ اور جب اگلی صبح میری آنکھ کھلتی تو میں سوچتی کہ آج گولیوں کو کہاں چھپایا جائے کیونکہ

نرسوں کی نگاہوں سے بچانے کے لئے میں ان گولیوں کا ٹھکانا ہر روز بدلتی رہتی تھی۔ غرض میں نے اپنی اسکیم کی ہر تفصیل سوچ لی تھی۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ اب کی مرتبہ مجھے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوگی اور اس خیال سے میرے تن بدن میں فاتحانہ خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔ یہ ایک ہولناک کھیل تھا جو اپنی جیت کے خیال سے مجھے اور بھی زیادہ دلچسپ اور دلکش نظر آنے لگا تھا۔ میں اکثر یہ سوچ کر میرے مرنے کے بعد جب لوگوں پر یہ حقیقت کھلے گی کہ میں نے کتنی چالاکی، عیاری اور اداکاری سے کام لیا تھا تو وہ کس قدر دنگ رہ جائیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ ان دنوں میں بھی دن کا بیشتر حصہ میں زندگی سے بیزار اور اچاٹ موڈ میں گذارتی تھی تاہم یہ خیال کہ جلد ہی سارا قصہ ہی پاک ہو جائے گا میرے ایام کو کسی قدر قابل برداشت بنا دیتا تھا۔

ویسے مجھے یہ یاد نہیں پڑتا کہ میرے مہربان ڈاکٹر صاحبان نے میرے ایام کو سہل بنانے میں دوائی کے علاوہ کبھی میری حوصلہ افزائی کی ہو، اور نہ کبھی کسی نے یہ ذکر کیا تھا کہ مصنوعی اعضا سے بھی انسانی جسم کو تکمیل بخشی جا سکتی ہے۔ نیز کسی نے مجھے یہ سمجھانے کی سعی نہ کی تھی کہ میں بھی نارمل اور خوش باش زندگی بسر کر سکتی ہوں۔ ممکن ہے اس میں بھی کوئی مصلحت میرے لئے پنہاں تھی۔ دیگر میرا خیال ہے کہ ان دنوں میری عقل ٹھکانے نہ تھی اور اگر کوئی مجھے اس قسم کا دلاسہ دلاتا تو میں اسے محض اپنی دلجوئی سمجھتی اور اس کے کہے پر ہرگز کان نہ لگاتی۔

آیکی توشی طہارا کو جسے مسیحی مذہب اختیار کئے تب دو سال ہو چکے تھے میرے وجود کا اس وقت علم تک نہ تھا لیکن جلد ہی ہماری مٹھ بھیڑ ہونے والی تھی۔ ہمارے درمیان پہلا رابطہ اک عجیب و غریب طریقے سے قائم ہوا۔

ہوا یوں کہ آیکی توشی طہارا کے مسیحی دوستوں میں سے ایک کو جاپانی زبان سیکھنے کے سلسلے میں دشواری پیش آرہی تھی اور اسے پرائیوٹ ٹیوٹر کی ضرورت تھی۔ اور جب آیکی توشی کی مدد سے اس ٹیوٹر کی خدمات کو حاصل کیا گیا تو وہ ان اساتذہ میں سے ایک تھا جن کے پاس میں کچھ عرصہ پہلے زندگی اور موت کے سوالوں پر بحث کرنے اور مدد طلب کرنے گئی تھی۔ میرے اس سابقہ استاد کی اپنے نئے شاگرد سے جلد اچھی خاصی دوستی ہوگئی۔ تعلیم و تدریس کے ان اوقات میں آیکی توشی بھی وہیں موجود ہوتا تھا کیونکہ وہ مشنری کے ساتھ ہی کام کرتا تھا۔ وہ جاپانی زبان میں ترجمہ کرنے میں اس کی مدد کیا کرتا تھا، اور میرا استاد سبق کے بعد اُن دونوں سے ان کے خاندان اور کام کاج کے متعلق دریافت کر لیا کرتا تھا۔ اسی طرح ایک دن باتوں ہی میں ہسپتالوں کا ذکر چلا تو میرے اُستاد نے کہا:

"کیا آپ لوگ ہسپتالوں میں مریضوں کی مزاج پرسی کیلئے بھی جاتے ہیں؟"

"جی ہاں، اکثر"، جواب دیا گیا۔

"میرا بھی یہی خیال تھا۔ میری بیوی کیتھولک ہے اس لئے مجھے

آپ کے اعتقادات کا کسی حد تک علم ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ مریضوں کی عیادت کو اہمیت دیتے ہیں۔"

تب وہ انہیں میرے متعلق بتاتے ہوئے کہنے لگے:

"یہ لڑکی ہمارے سکول میں ہی پڑھا کرتی تھی اور اچھی خاصی تھی۔ لیکن وہ اکثر اپنے مضامین کی بجائے زندگی اور موت کے متعلق سوالات پوچھا کرتی تھی۔ اس نے بارہا علیحدگی میں بھی مجھ سے اِن ہی مسائل پر بات چیت کی تھی اور مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی حتہ الوسع کوشش کے باوجود اسے کوئی مدد بہم نہ پہنچا سکا اور چند دنوں بعد اُس نے چلتی گاڑی کے سامنے آکر خودکشی کرنے کی کوشش کی لیکن بعض لوگوں کی بروقت مدد سے وُہ ہلاک ہونے سے بچ گئی۔ ویسے میرا خیال ہے کہ یہ ایک معجزہ ہے کہ اس کی جان بچ گئی۔ تاہم وہ اپاہج ہو چکی ہے اور آپ کی مدد کی محتاج ہے۔ آپ اسے ملنے کے لئے ہسپتال ضرور جائیں۔ اُس کا نام یونیکو سان ہے۔ آپ اِس نام کو اپنی ڈائری میں لکھ لیں۔"

غرض اِس طرح ایکی توشی طہارا کو میرے وجود اور میرے پسِ منظر کا کچھ حد تک علم ہُوا۔ اُس نے اور اُس کے مشترکہ دوست نے جلد ہی میری عیادت کے لئے آنے کا فیصلہ کیا۔ جب وہ میری ملاقات کے لئے آنے لگے تو ایکی توشی نے مشورہ دیا کہ وہ میرے لئے کوئی مٹھائی یا پھل بھی لیتے چلیں کیونکہ جاپان میں یہ رواج ہے کہ کسی کے عیادت کے لئے ہسپتال جاتے ہوئے لوگ خالی ہاتھ نہیں جاتے۔ خیر یہ دونوں میری ملاقات کو میرے کمرے

میں آئے، اور جب اُنھوں نے مجھے یہ بتایا کہ وہ کون ہیں اور کیا کرتے ہیں تو میں حیران بھی ہوئی اور پریشان بھی۔ کیونکہ پہلی نظر میں مجھے وہ معقول حضرات معلوم ہوئے تھے اور میں یہ سوچنے لگی تھی کہ یہ بظاہر بھلے چنگے مرد، دونوں کے دونوں سر پھرے مسیحی ہیں۔ مجھے مسیحی مذہب کا بے شک اس وقت تک کوئی علم نہ تھا لیکن میں اس سے اُسی قدر متنفر تھی جتنی ٹنزی کیو اور بدھ مت سے۔ کیوں نہ ہو! آخر میری والدہ اپنے مذہب کے بھرم ہی میں اپنی جان پر کھیل گئی تھیں۔ اس میں شک نہیں کہ وثوق سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مرض کے دوسرے حملے پر والدہ کو بچایا جا سکتا تھا یا نہیں۔ تاہم میرا یہ اعتقاد تھا کہ ڈاکٹر کی بروقت امداد کے نہ پہنچنے سے وہ فوت ہوئی تھیں اور اکثر سوچا کرتی تھی کہ اگر وہ آج زندہ ہوتیں تو میری یہ قابل رحم حالت نہ ہوتی۔

لہٰذا میں نے مذہب کے نام سے ان کی نسبت کا ذکر سنتے ہی انکے خلاف اپنا دل کڑا کر لیا اور اپنے آپ سے کہا:

"یہ لوگ عنقریب مجھ پر اپنے مذہب کا جادو چلانے کی کوشش کریں گے۔ لیکن جلد ہی اُن پر یہ حقیقت عیاں ہو جائے گی کہ ان "نالوں میں تیل نہیں اور مجھ سے ملاقات کے لئے آکر وہ اپنا قیمتی "وقت ضائع کر رہے ہیں۔" اگرچہ وہ اجنبی تھے اور بن بلائے آئے تھے، میں بظاہر اُن سے شائستگی سے پیش آئی کیونکہ شائستگی، مہمان نوازی اور اخلاق ہماری جاپانی تہذیب کا طرۂ امتیاز ہے، اور میرے اندرونی خیالات خواہ کیسے بھی تھے میں اُن کے ساتھ

گستاخی سے پیش نہ آئی۔
اَیکی توشی مجھے عجیب سی دزدیدہ نگاہوں سے بار بار دیکھ رہا تھا۔ بعد ازاں جب ہمارے درمیان دوستی کے روابط استوار ہو گئے تھے تو اُس نے مجھے بتایا کہ میرا چہرہ اسے مانوس لگا تھا اور وہ بار بار دیکھ کر یہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اُس نے مجھے کہاں دیکھا تھا۔ غالباً اس نے مجھے اپنے والد کی سائیکلوں کی دکان کے سامنے دیکھا ہوگا جو ہمارے گھر سے زیادہ دور نہیں تھی۔ اور دوسری وجہ جو اُس نے اپنے بار بار دیکھنے کی بتائی وہ یہ تھی کہ اُسے میرا چہرہ بہت پُرکشش نظر آیا تھا۔ لیکن میں اس وقت اُن دونوں وجوہات سے ناآشنا تھی اور اس کی للچائی سی نظروں کے سامنے کسمسا کر رہ گئی اور سوچنے لگی کہ یہ شخص مجھ پر ترس کھا رہا ہے لیکن مجھے اُس کے رحم کی بھیک درکار نہیں۔ اسے چاہیئے کہ اسے اپنے پاس ہی رکھے۔ مجھے کسی کے رحم کی چنداں ضرورت نہیں۔

مجھے یہ معلوم نہیں کہ آیا انہوں نے میری جھنجھلاہٹ کو بھانپ لیا تھا یا انہیں دوسرے لوگوں کو ملنے کے لیئے جانے کی جلدی تھی، وہ جانے کے لیئے اُٹھے تو ایکی توشی نے نئے عہد نامے کی کتاب جو وہ انجیل کے علاوہ ہمراہ لیتا آیا تھا میرے ہاتھ میں تھما دی۔ چونکہ میں اس وقت کچھ کہنے میں جھجک محسوس کرتی تھی اس لیئے میں نے منہ سے کچھ نہ کہا اور چُپ چاپ کتاب اس کے ہاتھ سے لیکر قریب پڑی میز پر رکھدی۔ لیکن سچ پوچھئے تو میں اپنے دل میں جل بھُن کر رہ گئی تھی کہ یہ سر پھرے لوگ کیا کر رہے ہیں۔ خیر میں

نے شکر کیا کہ وہ زیادہ دیر کمرے میں نہ ٹھہرے تھے۔
وہ گھر واپس جاتے وقت میرے متعلق بات چیت کرتے جا رہے تھے کہ انہوں نے اس سے پیشتر کسی کو اتنا غمزدہ، دل برداشتہ اور بیزار نہ دیکھا تھا۔ میرا معاملہ خاصہ گیا گذرا تھا۔ ویسے میرے متعلق اُن کے خیالات حقیقت سے دور نہ تھے کیونکہ میں واقعی بہت اداس رہتی تھی اور میرا دل بھول چکا تھا کہ خوشی کا احساس کیا ہوتا ہے۔
اُن کے جانے کے بعد جب مجھے تنہائی میسّر ہوئی تو میں نے گولیوں کو اُن کی جگہ سے نکالا اور یہ خیال کرتے ہوئے اُن کو گنا کہ کاش میں یہ جانتی کہ اپنی خستہ حال جان کے خاتمے کے لئے مجھے کتنی گولیاں درکار ہیں۔ نیز یہ کہ اگر مجھے یہ علم ہو جائے کہ اب یہ کافی ہیں تو میں آج رات ہی انہیں نگل کر اس زندگی کے بوجھ سے آزاد ہو جاؤں۔ لیکن خدا کی طرف سے میرے دل میں شک و شبے کا جذبہ سر اٹھانے لگا اور میں اپنے آپ سے یہ پوچھنے لگی کہ "اگر میں اب کی مرتبہ ناکام رہی تو پھر کیا ہوگا؟" دوبارہ ناکامی کا خطرہ یا خدشہ میں مول لینا نہیں چاہتی تھی اور میں گولیوں کی اتنی تعداد حاصل کرنے کی خواہاں تھی جس سے مقصد میں ناکامی کا امکان و احتمال ہی نہ رہے۔ کیونکہ میں جانتی تھی کہ ایسا ہونے پر کم از کم ہسپتال میں پھر ایسی کوشش کا امکان مفقود ہو جائے گا اور نجانے ہسپتال میں اور کتنے ماہ رہنا پڑے۔ پس میں صبر سے گولیاں جمع کرتی اور اس دن کا انتظار کرتی رہی جب یونیکو کے وجود

کا خول بھی ختم ہو جائے۔

لیکن وہ دن تو طلوع نہ ہُوا البتہ وہ دونوں یعنی آنکی نوشی طہارا اور اُس کا دوست اگلے اتوار کی سہ پہر کو پھر وارد ہو گئے۔ میرا خیال تھا کہ مَیں نے اپنی دانست میں ان کی کوئی حوصلہ افزائی نہ کی تھی اِس لیئے وہ دوبارہ مجھے زحمت نہ دیں گے مگر وہ میرے خیال سے زیادہ مستقل مزاج ثابت ہوئے۔ انہیں اپنے پلنگ کے قریب آتے ہوئے دیکھ کر مَیں سوچ رہی تھی۔

" مذہب کے متعلق فضول گفتگو کو ہرگز نہ سنوں گی"۔ لہٰذا مَیں نے اپنے آپ کو ان کے خلاف مستعد کر لیا۔ اور عزم کیا کہ مَیں ان کی باتوں میں کِسی قسم کی دلچسپی نہ لوں گی اور خود کوئی بات نہ کرونگی۔ غرض میں نے ان دونوں کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ بات کرنا تو در کنار میں اُن کے صرف ان ہی سوالوں کا "ہاں"، یا "نہ" میں جواب دے رہی تھی جن کو ٹال دینا تہذیب و اخلاق کے منافی ہوتا۔ بلکہ بارہا مَیں نے سَر کے اشارے سے کام چلانے کی کوشش کی۔ قصّہ کوتاہ یہ کہ مَیں نے اپنے ہر انداز سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ مجھے اُنکے مذہب سے کوئی دلچسپی یا سروکار نہیں۔

اپنے حادثے سے پہلے مَیں اپنے روّیے سے یہ ظاہر کرتی تھی کہ مَیں ماں کے غم کو بھُول چکی ہوں اور عام زندگی بسر کرنے کا حوصلہ رکھتی ہوں اور اِس اداکاری میں کامیاب بھی ہو جاتی تھی لیکن گراں کیوں تھی۔ اُن دنوں میں متواتر انتہائی اُداس اور برہم مزاج رہنے لگی تھی اور میرا چڑ چڑا پن سب پر روزِ روشن

کی طرح عیاں تھا۔ مَیں اِس کو قابو میں نہ رکھ سکتی تھی۔ میرے حادثے نے میری زندگی میں ہر شے کو یکسر بدل کر رکھ دیا تھا۔ اور مجھے اپنی کوئی چیز ٹھیک نہ لگتی تھی گویا حادثے نے سب چیزوں کو بے ڈھنگ اور بے ڈھب بنا دیا تھا۔ مثلاً اگر صبح اُٹھنے پر مَیں صاف شفاف آسمان کو دیکھتی اور جانتی کہ موسم اچھا رہے گا تو مجھے ایکدم غصّہ آجاتا کیونکہ میں یہ سوچتی کہ موسم کے اچھا یا بُرا ہونے سے مجھے بھلا کیا فرق پڑتا ہے۔ میں باہر جا کر اِس سے لطف اندوز نہیں ہو سکتی۔ مَیں تو وہ پرندہ ہوں جس کے پر کاٹ کر پنجرے میں بٹھا دیا گیا ہو۔ درختوں پر چہچہاتی چڑیوں کی آواز سے میں سٹپٹا جاتی کیونکہ مجھے یوں لگتا تھا کہ یہ چڑیاں میرا منہ چڑا رہی ہیں اور کہہ رہی ہیں ہم کتنے خوش قسمت ہیں کہ کھلی فضا سے محفوظ ہو سکتے ہیں اور تم اِس قدر بدبخت کہ قید و بند میں ہو۔ اِسی طرح جب والد یا میرے بھائی پھول لاتے تو میں بڑی کوشش سے ان سے یہ بات چھپاتی کہ مجھے شگوفوں سے نفرت ہو چکی ہے کیونکہ اُن کے شگفتہ اور خوبصورت رنگ دیکھنے سے مجھے ان دیدہ زیب کمونوں کی یاد آتی تھی جو والدہ میرے لئے تیار کیا کرتی تھیں۔ اور یہ بات مجھے خاص طور پر شاق گذرتی تھی کہ اب مَیں کبھی اس طرح کے پیارے ملبوسات نہ پہن سکوں گی اور اگر پہنوں بھی تو اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا کیونکہ میں کنوئیں کے مینڈک کی طرح اسی جگہ پڑی رہوں گی اور کہیں باہر نہ جا سکوں گی۔

لیکن کبھی کبھی میرا جی اس طرح یہ چاہتا کہ میرے احباب مجھے ملنے آئیں۔ لیکن جب کبھی وہ ایسا کرتے تو ان ملاقاتوں اور پہلی ملاقاتوں میں آسمان زمین کا فرق ہوتا اور پہلے سی بات پیدا نہ ہو سکتی۔ اوّل تو وہ مجھے دیکھتے ہی گویا دم سے ہو کر بغلیں جھانکنے لگتے اور دم ان کی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ مجھ سے کیا کہیں اور کس موضوع پر بات کریں۔ یاد رہے کہ یہ وہی لوگ تھے جن کی رفاقت میں میں پلی بڑھی تھی اور جن کے ساتھ میں تقریبات میں شریک ہوا کرتی اور سکیٹنگ وغیرہ کے لئے جایا کرتی تھی۔ یہ وہی لوگ تھے جن کی زبانیں تب قینچی کی طرح چلا کرتی تھیں اور اب ان ہی زبانوں پر گویا تالہ پڑ جاتا تھا۔ اور یہ بات مجھے بڑی غیر قدرتی سی لگتی تھی۔ اِن کے مقابلے میں اَیکی توشی طہارا اور اس کے دوست کو میرے ساتھ بات چیت کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آتی تھی حالانکہ میری اُن سے چند دنوں کی شناسائی تھی۔

یہ دونوں ہفتے میں ایک مرتبہ باقاعدگی سے مجھے ملنے کے لئے آتے رہے لیکن میں اُن کے ساتھ خوش خلقی سے پیش نہ آتی تھی، اور گو میں اُن کے گیت گانے سے لطف اندوز ہوتی تھی تاہم میں انہیں اپنے ساتھ بات چیت کا موقع مہیا نہ کرتی تھی اور ان کے سوالوں کے جواب میں "ہاں" یا "نہ" کہنے پر اکتفا کرتی۔ البتہ انہیں یہ وہم ضرور تھا وہ اپنا پیغام مجھ تک پہنچانے میں کامیاب ہو رہے ہیں مگر یہ اُن کی بھول تھی۔ اُن کے گانے سے بھی جو میں محفوظ ہوتی تھی تو محض اس لئے کہ اُنکے گیتوں

کی راگیں مجھے پسند تھیں لیکن جہاں تک اُن گیتوں کے الفاظ کا تعلق تھا وہ سب بالعموم میری سمجھ سے بالاتر تھے۔ مثلاً میں اُس اطمینان سے قطعی ناآشنا تھی جس کا ذکر وہ

"اطمینان خدا کا مثل دریا ہے، بڑھتا آگے بڑھتا فتح پاتا ہے"

گیت میں کہتے تھے۔ نہ میں خداوند یسوع کے لہو سے بچائے جانے کو سمجھ پاتی تھی جس کا بیان وہ ذیل کے الفاظ گا کر کرتے تھے:

"وہ چشمہ ہے معمور، داغ دل کے کرتا دُور
ہے مجھے دِل منظور، لہو جو کہ کروس سے جاری" وغیرہ

میرے عزم کی دیواران کے خلاف بدستور استوار تھی۔ میں ان کو دوبارہ آنے کی دعوت نہ دیتی تھی اور یہ سمجھتی تھی کہ اپنی ساری حرکات و سکنات اور رویّے سے ان کی حوصلہ شکنی کر رہی ہوں۔ لیکن میں تسلیم کرتی ہوں کہ میرے اس رویّے کے باوجود اُن کی موجودگی مجھے سکون و تسکین کا احساس دلاتی تھی اور میں اس امر کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ اگرچہ میں یہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ پھر آئیں اور گو میں انہیں بائبل پڑھنے یا اپنے ساتھ دعا کرنے کی اجازت نہ دیتی تھی تو بھی میں کشاں کشاں ان کے خدا کی طرف راغب ہوئی جا رہی تھی اور مجھے یہ صورتِ حال ہرگز پسند نہ تھی۔

پھر ایک دن یک لخت مجھے یہ احساس ہُوا کہ میں اُنکی آمد

کا اشتیاق سے اِنتظار کر رہی ہوں تو مجھے اپنے آپ پر شدید غصّہ آیا۔ اس پر میں پہلے سے بھی زیادہ محتاط ہو گئی۔ دراصل میں کسی مذہب کے چکّر میں پھنسنا نہیں چاہتی تھی۔ کہتے ہیں دودھ کا جلا چھاچھ کو بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے اور میرا بھی یہی حال تھا۔ ٹنری کیٹو کے عقیدے میں مایوسی سے دوچار ہونے کے بعد میں مذہب کو عبث و بیکار سمجھنے لگی تھی۔

میری دانست میں ہر مذہب خالی، بے معنی اور بے حاصل تھا اور ان سادہ لوح افراد کا مضحکہ اڑاتا تھا جو بھولپن میں اُسے اختیار کر لیتے ہیں۔ غرض جب ایکی توشی اور اس کا دوست میری ملاقات کے لئے آتے تو میری سوچیں اسی قسم کی ہوا کرتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں انہیں اپنی مساعی میں کوئی پیش رفت نظر نہ آتی تھی۔ وہ اکثر آپس میں میرے متعلق گفتگو کرتے اور مجھ سے ملاقات کے بعد میرے ایک آدھ جملے کی خوب چھان پھٹک کرتے تاکہ یہ معلوم کریں کہ میری سوچیں کس سمت میں جا رہی تھیں۔

ایک یا دو ماہ بعد ایکی توشی کو یقین ہو گیا کہ ملاقاتوں کے اس سلسلے کو جاری رکھنا بے سود ہو گا۔ وہ ہمیشہ میری سوچوں اور میرے "موڈ" کو مجھ سے بھی پہلے جان لیا کرتا تھا۔ تاہم وہ دونوں میری ملاقات کو آتے رہے حالانکہ انہیں اپنے شک و شبے کے خلاف خاصی ذہنی کشمکش برداشت کرنی پڑتی۔

ایکی توشی نے بارہا اپنے دوست سے کہا کہ یونیکو زندگی سے

انتہائی درجے تک مایوس ہے کہ اُس کا دِل پتھر ہو چکا ہے اور پتھر کو موم کرنا اُن کے لئے مشکل ہے۔ آج میں اُن کی کس قدر ممنون ہوں کہ انہوں نے اعتماد میں کمی یا بے اعتقادی کے باوجود ملاقاتوں کے سلسلے کو ترک نہ کیا جو میرے لئے انجانے طور پر باعثِ تسکین ہُوا کرتی تھیں۔

پیشتر ازیں ذکر آیا ہے کہ مجھ سے گفتگو کرتے ہُوئے میرے منافی رویّے کے باوجود وہ دقت محسوس نہ کرتے تھے۔ میرا خیال ہے ایک دن باہر بولتی چڑیا کی آواز سُن کر ایکی توشی پرندوں اور پھر طوطوں کا ذکر کرتے ہوئے بولا:

"طوطے بھی خوب ہوتے ہیں۔ اُن کو باتیں کرنا سکھانا خاصہ دلچسپ مشغلہ ہوتا ہے۔ کیا آپ طوطوں کا جوڑا پسند کریں گی؟ انہیں بآسانی اِس کمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔"

اِتفاق کی بات ہے کہ طوطے مجھے پسند تھے اور مَیں انہیں پالنا چاہتی تھی۔ لیکن مَیں نے اس وقت محض اِس خیال سے "ہاں" کر دی کہ غالباً یہ لوگ کمرے سے باہر نکلتے ہی یہ سب بھُول جائیں گے کیونکہ بہت سے لوگ جو مجھے ملنے آتے میرے روبرو اخلاقاً خود بخود کئی وعدے کر ڈالتے کہ وہ میرے لئے یہ کریں گے یا یہ لائینگے لیکن پھر اپنے وعدے بھُول جاتے۔ اِسی لئے مَیں نے انہیں بھی دوسرے لوگوں جیسا ہی سمجھا۔ لیکن میرا قیافہ غلط ثابت ہُوا۔ کیونکہ اگلی مرتبہ جب وہ آئے تو اپنے ہمراہ پنجرے میں طوطوں کا جوڑا لیتے آئے۔ اور ان کا یہ عمل ان کے الفاظ سے کہیں

زیادہ میرے دل پر اثر انداز ہُوا۔ اور تب مجھے خیال آیا کہ وہ اپنی بات کے پکے اور قول کے سچے ثابت ہوئے تھے۔ مثلاً اگر وہ کسی دن ملاقات کو آنے کے لئے کہتے تو وہ ضرور آتے اور اگر میرے لئے کوئی کام کرنے کا ذمہ لیتے تو وہ ہمیشہ سرانجام دیتے غرض میں اُن کی وقت اور وعدے کی پابندی اور دیگر ایسی کئی خوبیوں سے یقیناً متاثر ہوئی۔ لیکن اتنا ضرور کہدوں کہ اس دن بھی انکے متعلق رائے قائم کرتے ہوئے میں نے یہی کہا تھا کہ

"یہ دونوں یا تو سر پھرے احمق ہیں یا پھر دیگر افراد سے قطعی مختلف!"

مَیں خود تو تب اس امر سے آگاہ نہ تھی لیکن ایکی توشی کا کہنا ہے کہ اُس دن سے میرے رویّے میں تھوڑا سا فرق پڑ گیا تھا۔ جیسے میرے گرد چڑھے ہوئے خول میں جو مَیں نے اپنی دفاع کے لئے چڑھا رکھا تھا بال آگیا ہو۔ اس میں کلام نہیں کہ میں تاحال بدستور مذہب کے خلاف تھی اور ان کے اعتقادات کے بارے میں کچھ سننے کے لئے تیار نہ تھی۔ تاہم اس واقعے کے بعد ایسے ایام بھی آئے جب بقول اُن کے میرا رویّہ مقابلتاً کم سخت اور کسی قدر دوستانہ تھا۔

ایسٹر آیا اور اس کے ساتھ ہی اُس چھوٹے چرچ میں جہاں ایکی توشی جاتا تھا ایک خاص خادم تشریف لائے۔ وہ اپنے ساتھ وہاں کی کلیسیا کے لئے ایک پیغام تیار کر کے لائے ہوئے تھے مگر انہیں اپنا یہ پیغام بالائے طاق رکھنا پڑا، کیونکہ جیسا کہ بعد ازاں

مجھے بتایا گیا عین عبادت کے دوران جب حمد و ثنا کا نذرانہ خدا کے حضور پیش کیا جا رہا تھا خدا نے اپنے اس خادم کو پیغام کے متعلق خصوصی ہدایت دیں اور انہوں نے اپنے تیار کردہ وعظ کے کاغذات بادل نخواستہ ایک طرف رکھ دیئے اور جوں جوں ان کے دل میں خیالات آتے گئے وہ انہیں نئے کاغذ پر سپرد قلم کرتے گئے۔ یہ نیا پیغام موقع کی مناسبت سے انجیل جلیل کے اُس حوالے پر مبنی تھا جہاں مسیح خداوند اماؤس کی راہ پر چلتے ہوئے دو مردوں کے ساتھ ہو لئے تھے۔ اور یہی وہ پیغام ہے جس کے سننے سے مجھ پر اس جلیل القدر سچائی اور حقیقت کا انکشاف ہوا کہ مسیح زندہ ہے۔

ان ایام میں ہر اتوار کو ایک یا دو اشخاص اپنی زندگی کو خاص طور پر مسیح کے سپرد کرتے تھے اور عبادت کے اختتام پر سامنے آکر اس امر کا اظہار کرتے کہ انہوں نے مسیح کو اپنا شخصی نجات دہندہ تسلیم کر لیا ہے۔ لیکن آج جبکہ چرچ میں اس خادم الدین کے لئے سب چہرے نئے تھے کسی نے سامنے آکر اپنے ایمان اور اقرار کا برملا اظہار نہ کیا۔ جس پر مبلغ مذکور کو پریشانی ہوئی اور میٹنگ کے اختتام پر انہوں نے اپنے دوستوں سے کہا

"کیا آپ سمجھتے ہیں کہ پیغام کو بدلنے میں میں نے غلطی کی ہے"؟

لیکن ہوا یوں کہ اُن کا ایک دوست اس شب اپنے ٹیپ ریکارڈر کے ساتھ وہاں حاضر تھا اور اس نے اُن کا وہ پیغام ریکارڈ کر کے

ریکارڈر کو ایکی توشی اور اُس کے مشنری دوست کے حوالے کر دیا تھا، اور غالباً اُسی وقت ایکی توشی نے یہ مشورہ دیا کہ یہ ٹیپ کسی وقت ہسپتال میں لاکر مجھے سنوایا جائے۔

بہرحال وہ اس ہفتے چرچ کی سرگرمیوں میں بہت مصروف رہے اور انہیں جمعرات یا جمعہ کی شام کو ہسپتال آنے کی فرصت ملی۔ وہ اس دن شام کو نو بجے مجھے ملنے آئے اور انہوں نے بڑا سا بکس اُٹھا رکھا تھا جو مجھے تابوت جتنا بڑا لگ رہا تھا۔

خدا مجھے اُن کی آمد کے لئے تیار کر رہا تھا۔ میں اس دن سارا دن بڑے بُرے موڈ میں رہی تھی اور میرے خیالات موت اور سفید گولیوں پر ہی مذکور رہے تھے جو میرے خیال میں اس منحوس زندگی سے میری رہائی کا واحد وسیلہ تھے اور جب میں نے دیکھا کہ اتنی شام ڈھلے کون آیا ہے تو میں بیزاری سے سوچنے لگی:

"لو یہ اُلٹی کھوپڑی والے پھر آن دھمکے۔ اِن کے ساتھ کون مغز ماری کرے گا" اور واقعی اس دن میرا جی اُن کے شیریں گانے سننے پر بھی آمادہ نہ تھا۔ میں صرف تنہائی کی خواہاں تھی۔

اب مجھے یہ یاد نہیں کہ میں اس دن اُن سے کس طرح پیش آئی تھی اور آیا انہوں نے ٹیپ ریکارڈر لگانے کے لئے میری اجازت لی تھی یا نہیں۔ ویسے اُن کا کہنا ہے کہ ان دونوں میں سے کسی کو اس کارروائی سے کسی مثبت ردِعمل کی توقع نہ تھی، اور وہ یہ سوچ رہے تھے کہ ممکن ہے اس مشین کی ناولٹی میرے

لئے کسی قدر دلچسپی کا سامان پیدا کر سکے کیونکہ اُن دنوں ٹیپ ریکارڈر نئی نویلی چیز تھی۔ نیز خداوند یسوع کا پیغام پہنچانے کا یہ اِک اور موقع ہوگا۔ البتہ مجھے یہ ضرور یاد ہے کہ مَیں جلد ہی واعظ کے الفاظ کو بغور سننے لگی تھی جو مسیح خداوند کے صلیب پر مرنے اور اس کے مُردوں میں سے جی اُٹھنے کا بیان کر رہے تھے۔ اور اب نہایت خلوص سے سننے والوں کو دعوت دے رہے تھے کہ وہ ایسے مسیح پر ایمان، اعتقاد رکھیں جو زندہ ہے اور ہمیشہ رہیگا اور قابل اعتماد ہے۔ اس کے بعد مقرر نے مسیح کی محبت کا ذکر کیا تھا جو اُسے گنہگار سے ہے واعظ نے اس کے علاوہ بھی کچھ کہا ہوگا لیکن مَیں سوچنے لگی کہ مسیح کو یہ پرواہ نہیں کہ لنجی لنگڑی بلکہ ٹنڈی منڈی ہوں وہ اِن سب نقائص کے باوجود مجھے پیار کرتا ہے اور اسے اِس امر کی بھی پرواہ نہیں کہ مَیں اس سے نفرت کرتی رہی ہوں۔ ہاں وہ زمین پر آیا اور لوگوں کے درمیان رہا اور صلیبی موت مرا اور قبر سے جی اٹھا تاکہ مجھ جیسوں کو بچا سکے۔ اری بونیکو وہ تمہیں اِتنا پیار کرتا ہے کہ اس نے یہ سب کچھ تمہارے لئے کیا تاکہ تمہیں اپنے ساتھ جلال میں پہنچائے۔ اور وہ اماؤس کی راہ پر چلتے ہوئے دو شخصوں کے ساتھ اِس لئے ہو لیا تاکہ تم یقینی طور پر جان جاؤ کہ اس نے موت پر فتح حاصل کی ہے۔

اب مجھے احساس ہُوا کہ میری زندگی کے اُلٹے سیدھے واقعات کے باوجود مسیح مجھے پیار کرتا ہے اور مجھے اپنے پاس بُلانے کا خواہشمند ہے۔ مجھے یہ علم نہیں کہ واعظ نے اور کیا کہا یا وہ میرے

علاوہ وہ کسی اور سے بھی مخاطب تھا۔ کیونکہ مجھے یوں لگتا تھا گویا وہ اس کمرے میں موجود ہو اور میرے سامنے اُسی کرسی پر براجمان ہو جس پر ریکارڈر پڑا تھا۔ نیز یہ کہ اس کی آواز میں خدا مجھ سے ہمکلام ہو رہا ہو۔ غالباً پیغام کے نصف حصّے تک پہنچتے پہنچتے میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور ڈھلک کر بے اختیار رخساروں پر بہنے لگے۔ اور جب پیغام اختتام کو پہنچا اور ایکی توشی نے ریکارڈر بند کیا تو وہ بڑی سنجیدگی سے مجھے دیکھ رہا تھا اور اس لمحے وہ پردہ جو میں نے اپنی دفاع کے لئے کھڑا کر رکھا تھا، یکایک غائب ہو گیا۔

"یونیکو سان، کیا آپ دُعا کرنا پسند کریں گی"؟ وہ دھیمی آواز میں بولا۔

اور میں نے سر جھکا کر ذیل کے الفاظ کہے

"خدایا میری مدد کر۔ خُدایا میری مدد کر"

میں یہی جملہ دہرا رہی تھی۔ یہی میرے دل کی آواز اور رُوح کی پکار تھی۔ اپنی نااہلیت کا احساس کرکے میں خدا کی مدد کی اشد ضرورت کو محسوس کر رہی تھی۔ اور میں خیال کر رہی تھی کہ میں نے اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھ ڈالے ہیں۔ مگر وہ تاحال میرے رخساروں پر بہتے چلے جا رہے تھے، تاہم مجھے اس کی خبر نہ تھی۔ میں صرف اس بات سے آگاہ تھی کہ میری آنکھیں گرمی سی محسوس کر رہی ہیں۔

جب میں "خدایا میری مدد کر" کی سادہ سی دعا میں اپنا دِل

انڈیل رہی تھی تو میری سوچیں یہ تھیں کہ میں اس خدا پر اپنا پورا اعتقاد رکھوں گی اور جو کچھ مستقبل میں میرے حصّے میں آیا اسی کا ہوگا۔ دُعا کے بعد ایکی توشی اور اس کے دوست نے مزید کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہ کی اور اگر کہا ہو تو کم از کم مجھے یاد نہیں۔ اور جونہی وہ کمرے سے باہر نکلے نیند سے میری آنکھیں بوجھل ہونے لگیں اور میری آنکھ لگ گئی۔

اور اگلے دن سات بجے جب میری آنکھ کھلی تو میں اس معمولی سی بات پر حیران تھی کہ میں پوری رات سکون سے سوئی رہی ہوں۔ جبکہ کئی مہینوں سے میں اس طرح گہری نیند نہ سوئی تھی۔ اب میں نے اپنے اردگرد نگاہ ڈالی۔ نیلگوں آسمان صاف شفاف تھا اور اس پر بادل کے ٹکڑے کا نام و نشان نہ تھا اور مئی مہینے کی دھوپ پھولوں کو کھلنے کی دعوت دے رہی تھی۔

"آج کی صبح کس قدر خوبصورت ہے" میرے دل میں لامحالہ خیال آیا۔

"ہائیں میں اس نہج پر کیوں سوچ رہی ہوں"؟ دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔ کیونکہ حادثے کی اس المناک شب کے بعد میرے لئے کسی خوبصورت صبح کا طلوع نہیں ہُوا تھا۔ میں نے اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالی ناشتے کے آنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ میرے پلنگ کے پاس میز پر نئے عہد نامے کی وہ جلد پڑی تھی جو ایکی توشی نے پہلی ملاقات پر پیش کی تھی۔ میں یہ سوچنے لگی کہ یہ یہاں کیسے آگئی جبکہ میں نے نرس سے کہہ کر اسے

وہاں سے اُٹھوا دیا تھا۔ پھر میں نے اُسے ہاتھ میں لے لیا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگی۔ نئی کتاب کا جائزہ لینے کے لئے ہمیشہ سے میری یہ عادت رہی تھی کہ اس کے آخری صفحوں پر نگاہ ڈالوں کیونکہ میرا خیال تھا کہ ہر کتاب کا بہترین حصّہ اس کا آخری حصّہ ہی ہوا کرتا ہے۔ لہٰذا میں اس کے آخری حصّے میں سے کہیں کہیں سے اِکّا دکّا آیت پڑھتی کتاب کے شروع کی طرف صفحے پلٹتی جا رہی تھی۔ بیشتر آیات میری سمجھ سے بالاتر اور میرے لئے کوئی معنی نہ رکھتی تھیں۔ مگر خدا میرے حق میں لگاتار مصروف کار تھا اور خواہاں تھا کہ مجھ پر اپنے عجیب کام کو ظاہر کرے۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ گذشتہ شب کا واقعہ میرے لئے تا حال معمہ اور اجنبہ سا تھا میں عجیب سی غیر یقینی کی سی حالت میں ورق گردانی کرتی جا رہی تھی تب اچانک میری نگاہیں ایک آیت پر ثبت کر رہ گئیں۔ مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ یہ آیت خود میری طرف لپک اٹھی ہو۔ الفاظ تھے "اگر کوئی مسیح میں ہے تو وہ نیا مخلوق ہے"۔

یک لخت میرے تن بدن میں جوش و مسرّت کی لہر دوڑ گئی۔ میرا جی چاہا کہ بآواز بلند پکار پکار کر دنیا والوں سے کہوں دیکھو یہاں میرا ذکر ہے۔ میرے ساتھ بعینہٖ یہی ہُوا ہے"۔ اور اس تغیر و انقلاب کے احساس سے مجھے اپنے اندر اس قدر جوش و ولولہ محسوس ہو رہا تھا کہ میں اس کے متعلق کسی دوسرے کو بتانے کے لئے بُری طرح بے چین تھی۔ غرض میں نے آواز دیکر

ادھیڑ عمر کی اُس عورت کو جگایا جو میرے ساتھ اُس کمرے میں رہائش کرتی تھی۔ اور جونہی وہ بیدار ہوئی مَیں نے اُسے بتایا کہ مسیح نے میرے لئے عجیب و غریب کام کیا ہے۔ مجھے نیا بنا دیا ہے۔ وہ عورت مجھے خوش دیکھ کر دنگ رہ گئی اور پھر کسی قدر توقف کے بعد بولی:

"اگر تمہارا مذہب اِتنا ہی حیرت انگیز ہے جتنا تم کہہ رہی ہو تو مجھے اس کے بارے میں اور زیادہ جان کر خوشی ہوگی۔"

اِس کے تھوڑی دیر بعد مَیں بڑی بے صبری اور بے تابی سے اَیکی توشی اور اس کے دوست کا اِنتظار کرنے لگی تاکہ اُنہیں بتا سکوں کہ خدا نے میرے حق میں اُن کی دُعاؤں کو بالآخر شرفِ قبولیت بخش دیا ہے اور میرے متعلق ہر چیز کو بدل دیا ہے۔

ساتواں باب

بہار آچکی تھی!

ہسپتال کی کھڑکی سے مَیں صاف شفاف نیلگوں آسمان کا نظارہ کر رہی تھی جس پر دُور دُور تک بادل کا نشان تک نہ تھا۔ اور کھڑکی میں سے جو درخت، گھروں کے صحن یا کونے نظر آرہے تھے وہ سب کے سب نکھری دھوپ میں چمک دمک رہے تھے۔ اور پھول جو موسم سرما میں گویا گہری نیند سو رہے تھے اب بیدار ہو کر لاتعداد غنچوں اور شگفتہ پھولوں کا رُوپ اختیار کر چکے تھے اور ہَوا میں جھومتے ہُوئے ان پھولوں کی طرح بچے بھی جا بجا اچھل کُود کرتے نظر آرہے تھے گویا وہ بھی ان ہی کی طرح زمین سے اُگ نکلے ہوں۔ ہرنوں کی طرح قلانچیں بھرتے ہوئے بچوں کو دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایسے حسین موسم میں زندگی کے بھرپُور احساس سے خاص خوشی و مسرت محسوس کر رہے ہیں۔ اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ مُدت بعد آج مَیں بھی خوش و شادمان تھی۔

کیونکہ گذشتہ چند دنوں سے میرے دل میں بھی بہار آچکی تھی۔ یاس و ناامیدی کی یخ بستہ سردی میری زندگی سے یکسر غائب ہو

چکی تھی۔ اور جہنم واصل کرنے والی مہلک گولیاں جنہیں میں کمال عیاری سے جمع کر رہی تھی اب تکیہ غلاف میں بھولی بسری پڑی تھیں۔ اس لئے کہ خداوند یسوع پر ایمان لا کر میں پہلے والی یونیکو نہ رہی تھی بلکہ "نئی مخلوق" بن چکی تھی۔ ہاں ایسی ہستی جس کے لبوں پر مسکراہٹ ناچتی تھی اور اس طرح میں بھی ہر نئے دن کا نئی امید اور نئی مسرت کے ساتھ خیر مقدم کر سکتی تھی۔

لیکن میرے گھر والے میرے اندر اس تغیر کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ دراصل اب تک وہ ایسی یونیکو کو دیکھنے کے عادی ہو گئے جو ماں کی موت سے پہلے والی یونیکو کا محض خول تھی۔ اور جو جسمانی اور روحانی طور پر شکست و ریخت کے عمل سے دوچار ہو کر ایسی تباہ حال تھی کہ وہ زندگی سے اچاٹ اور دنیا سے بیزار ہو چکی تھی۔ اور جس کی عزیز ترین دعا اور تمنا اگر کوئی تھی تو یہی تھی کہ جلد از جلد موت کا لقمہ بن کر اس زندگی کے سارے مسائل سے یکسر اور یک لخت رہائی پا جائے۔

بے شک میں نے یا انہوں نے ایک دوسرے کے سامنے کئی ہفتوں سے اشارتاً بھی خودکشی کا ذکر نہ کیا تھا، تاہم وہ بخوبی جانتے تھے کہ میں درپردہ اپنے آپ کو ختم کرنے کی ترکیبیں سوچ رہی ہوں اور وہ مجھے اس اقدام سے روکنے کے ضمن میں اپنے آپ کو بے بس پا رہے تھے۔ لیکن ہر ملاقات کا وقت ختم ہو جانے پر جب وہ میرے کمرے سے باہر جاتے تو ان کی آنکھوں میں اس خوف اور خدشے کی نمایاں جھلک ہوتی کہ شاید یہ ملاقات ان کی آخری ملاقات

ہو۔ ظاہر ہے کہ ان حالات کے تحت جب انہوں نے ایک سہ پہر مجھے انتہائی دل برداشتہ اور دوسری شام ہنستا مسکراتا دیکھا تو وہ حیران و ششدر رہ گئے۔ حالیہ ایام کی غمزدہ یونیکو غائب ہو چکی تھی اور ایک خوش و خرم یونیکو نے اس کی جگہ لے لی تھی۔ میری مسکراہٹ سے طنز کی کڑواہٹ دور ہو چکی تھی اور میری آنکھوں سے اک نیا سکون و اطمینان چھلکتا تھا۔

میں کئی مہینوں سے صرف اپنا ہی خیال کرتی آئی تھی اور فقط اپنے پر ہی ترس کھاتی رہی تھی گویا مجھ سے پہلے کبھی کسی اور نے زندگی میں مایوسی یا ناامیدی کا سامنا نہ کیا ہو۔ لیکن آج مجھے اپنے والد، پوریکو اور دونوں بھائیوں کی فکر تھی۔ میں یہ جاننا چاہتی تھی کہ وہ کیسے ہیں اور کیا کچھ کیا کر رہے ہیں۔ میں نے اپنی بھابی کا حال احوال دریافت کیا نیز یہ کہ آیا چھوٹا بھائی اپنے سکول میں خوش تھا یا نہیں؟

میرے عزیز اس نئے اندازِ فکر سے جس قدر خوش تھے اُسی قدر اس سے دنگ اور ششدر تھے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ انہیں مجھے شادمان دیکھ کر کتنا سکون و اطمینان حاصل ہوا تھا۔ تاہم اُن کے نزدیک اس خوشی و اطمینان کا کوئی خاطر خواہ جواز نہ تھا، لہٰذا ان کے دل میں طرح طرح کے وہم و گمان پیدا ہو رہے تھے۔

گھر میں میری اس تبدیلی پر خوب تبصرہ ہوا۔ وہ سب اس کی اصل وجہ دریافت کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور سوچ

رہے تھے کہ آیا یہ تبدیلی دیرپا ثابت ہوگی یا نہیں ؟ والد صاحب کا کہنا تھا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ دراصل میری والدہ کی بیماری کے پہلے حملے سے لے کر انہوں نے پے در پے اتنی مصائب برداشت کی تھیں کہ وہ اس انقلاب کو بھی کسی آنے والی بھاری آفت کا پیش خیمہ سمجھ رہے تھے، حالانکہ میں نے ان کے سامنے بڑی وضاحت سے یہ بیان کرنے کی کوشش کی تھی کہ میری زندگی میں اس خوش آئند تغیر اور تبدیلی کا موجب خداوند یسوع مسیح ہے۔ کیونکہ اس نے میرے گناہوں کو معاف کرکے میری زندگی کی گویا باگ ڈور سنبھال لی ہے، اور اسی نے مجھے سکون و اطمینان اور جینے کے لئے ہمت عطا کی ہے۔ لیکن وہ سب میری بات کو سمجھنے سے قطعی قاصر تھے۔

اور میرے جوش و خروش یا خوشی کے بارے میں میرے والد کا یہ خیال تھا کہ یہ اک وقتی حالت ہے جو بعض اوقات ان لوگوں پر طاری ہو جاتی ہے جو خودکشی کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ لہٰذا انہیں خدشہ تھا کہ میں نے ضرور اس سلسلے میں کوئی یقینی کامیابی کی حامل تدبیر سوچ لی ہوگی جس سے میں اسقدر خوش اور پُرجوش دکھائی دے رہی تھی۔ لیکن میرے بھائیوں کی رائے والد صاحب سے مختلف تھی۔ وہ کہہ رہے تھے کہ میری طبیعت کی افتاد ماں پہ پڑی ہے۔ والدہ حالانکہ قوی کردار اور قوتِ ارادی کی مالکہ تھیں تاہم مذہب کے معاملے میں خاصی

جذباتی واقع ہوئی تھیں اور میرا بھی بعینہٖ یہی حال تھا۔ اگر فرق تھا تو صرف اتنا کہ انہوں نے اپنی عقیدت ٹڈی کیٹو کے عقیدے کے لئے وقف کر دی تھی جبکہ میں نے مسیح کو چن لیا تھا جو میری ساری زندگی پر چھا گیا تھا۔ ان کے خیال میں مذکورہ بالا ہر دو مذہب توہم پرستی پر مشتمل تھے اور دونوں ہی کے علیحدہ علیحدہ کئی دیوتا بھی تھے۔ لیکن دونوں کا اپنے پیروکاروں پر ایک ہی جیسا اثر تھا یعنی دونوں ہی کے عقیدت مند جنونی اور متعصبی بن جاتے تھے۔

لہٰذا وہ میرے بارے میں اسی طرح قیافہ آرائیاں کرتے رہے اور انہوں نے میری باتوں کو سمجھنے کی زیادہ کوشش بھی نہ کی۔ بالکل اسی طرح جس طرح میرے استادوں نے میرے خیالات پر غور کرنے کی بجائے مجھے یہ صلاح دی تھی کہ زندگی اور موت کے متعلق مسائل کو سمجھنا دشوار ہے ان کو بالائے طاق رکھ دو۔

البتہ ایک بات جو میرے گھر والوں کی سمجھ میں آئی وہ یہ تھی کہ یہ سب اس سر پھرے نوجوان اینی تو شی طھارا اور اسکے دوستوں کا کیا دھرا ہے جو ہسپتال میں میری عیادت کے لئے باقاعدگی سے آنے لگے تھے۔ اور ان کا خیال تھا کہ یہ "موڈ" (کیونکہ وہ میری تبدیلی کو "موڈ" سے زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے) دیر پا ثابت نہ ہو گا۔ نیز یہ کہ ہسپتال سے گھر آنے پر جب میں کچھ عرصہ ان کے ساتھ قیام کروں گی تو میری عقل ٹھکانے آجائے گی اور نئے مذہب کا سارا نشہ ہرن ہو جائے گا۔

تاہم وہ اس امر سے خوش تھے کہ میرے لئے اپنی ذات اور اپنی

تکالیف سے توجہ ہٹانے کی کوئی سبیل تو پیدا ہوئی اور وہ گمان کرتے تھے کہ ممکن ہے کہ مایوسی کی گہرائیوں سے باہر نکلنے کا یہ "موڈ" قائم رہ سکے یا جب میں اس نئے مذہب سے مایوس ہو جاؤں تو تب تک مجھ میں اتنی ہمت پیدا ہو جائے کہ زندگی کا دوبارہ سامنا کرنے پر آمادہ ہو جاؤں۔ لیکن اُن کی سب سے بڑی دعا اور تمنا یہ تھی کہ مذہب میں مایوسی اگر ناگزیر ہے تو مجھے اس سے بتدریج اور دیر سے دوچار ہونا پڑے تاکہ ناگاہ اس سے پالا پڑنے سے میں بھونچکا نہ رہ جاؤں اور میری شخصیت از سرِ نو ٹوٹ کر کرچی کرچی نہ ہو جائے۔

لیکن وہ بیچارے میری خیر خواہی کے خیال سے اُمید و بیم کے سمندر میں غوطے کھاتے اس قسم کی قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ اور صرف انسانی قوتوں اور انسانی خامیوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایسے وہم و گمان میں مبتلا تھے۔ ان کے خیالات اور خدشات میں خدا کا دخل نہ تھا۔ لیکن جہاں تک میری ذات کا تعلق تھا مجھے جینے کا نیا جواز اور زندگی کا نیا مدعا و مقصد مل چکا تھا میری سوچوں کو نئی سمت اور میرے وجود کو نئی طاقت حاصل ہو گئی تھی۔ علاوہ ازیں خدا مجھے ہر روز ایسا سکون و اطمینان بخش رہا تھا جس سے میں اپنے حسین بچپن کے بیفکری کے ایام میں بھی ناآشنا تھی۔ میں اب اُس خدا پر کامل اعتماد رکھنے لگی تھی اور یہ اعتماد اُس بھروسے سے بھی زیادہ تھا جو میں اپنی والدہ پر اس وقت کیا کرتی تھی جب میں اپنا مُنا سا گداز ہاتھ ان کے ہاتھ میں تھما کر اطمینان سے

ٹریفک کی بھرمار والی سڑک پر قدم مارنے لگتی تھی۔

اِس میں شک نہیں کہ مجھے تاحال خدا اور اسکے کلام کی زیادہ سمجھ بوجھ نہ تھی بلکہ میری حالت اس ضمن میں شیرخوار بچے سے زیادہ نہ تھی کیونکہ میری معلومات ابھی تک بہت محدود تھیں۔ خیر ایکی توشی طہارا اور اُسکے دوست میرے لئے خاصے فکرمند تھے۔ وہ سب مجھ سے بھی زیادہ بخوبی جانتے تھے کہ میرے گھر والے میرے نئے مذہب کے کس قدر مخالف ہیں۔ نیز وہ جانتے تھے کہ میرے لئے اپنے بھائیوں کی دلائل کا متواتر مقابلہ کرنا کتنا مشکل ہوگا جو کالج کے ذہین طالب علم تھے۔

مسیحی مذہب کو قبول کرنے کے کچھ ہفتوں بعد مجھے ہسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا اور جب مَیں گھر آنے کی تیاری کر رہی تھی تو ایکی توشی نے پیشکش کی کہ وہ ہفتہ میں ایک بار میرے ہاں آکر میرے ساتھ بائبل سٹڈی کیا کرے گا۔ مَیں نے اس پیش کش کو بخوشی قبول کر لیا اور بائبل سٹڈی کے یہ اوقات نہ صرف میرے لئے باعثِ برکت ثابت ہوئے بلکہ گھر پر مسیحی زندگی گذارنے میں اس سے مجھے بہت مدد ملی۔

میری دلی تمنا تھی کہ میرے گھر والے بھی مسیح کو جانیں اور پہچانیں مگر مذہب کے متعلق والد یا بھائیوں سے کچھ کہنا قطعی ناممکن تھا۔ البتہ پوریکو سے میں مقابلتاً آسانی سے خداوند یسوع کے بارے میں بات چیت کر سکتی تھی کیونکہ والدہ کی وفات کے بعد ہم دونوں ہی کو ایک دوسرے کی ضرورت تھی اور اس طرح ہم ایک دوسرے کے بہت قریب ہو گئے تھے۔ اس کے سلوک میں مجھے

ماں کی سی شفقت کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ اور گو ہم دونوں کی عمر میں ۵ پانچ سال کا فرق تھا تاہم بعض دن ایسے بھی ہوتے تھے جب یہ فرق ایک یا دو ماہ کا فرق محسوس ہوتا یا یوں لگتا گویا ہم جڑواں بہنیں ہوں۔ لیکن بعض دن ایسے بھی ہوتے جب وہ مجھے اپنی دادی اماں کی طرح کسی اور نسل سے تعلق رکھنے والی معلوم ہوتی۔ بہرحال وہ مجھے بہت پیار کرتی تھی اور میں اس سے ہر موضوع پر گفتگو کر لیا کرتی تھی ایک دن میں اُسے رُک رُک کر خداوند یسوع کے متعلق بتانے لگی اور وہ غور سے سنتی رہی۔ اور میں سوچنے لگی کہ وہ میرے منجی میں دلچسپی لینے لگی ہے لیکن وہ میرا مذاق اُڑاتے ہوئے بولی

"یوں معلوم ہوتا ہے گویا تمہیں مسیح سے محبت ہو گئی ہو"

لیکن چونکہ میں اس کو یہ بتانے کی اس قدر مشتاق تھی کہ مسیح نے میرے لئے کیا کیا کیا ہے اس لئے میں نے اُس کے لہجے میں طنز کو نہ پہچانا اور بولی

"واقعی میں اس سے محبت کرتی ہوں۔ اس نے مجھے اس قدر خوشی اور اطمینان بخشا ہے کہ میں کلی طور پر اس کا شکر ادا نہیں کر سکتی اور پوریکو وہ تمہارے لئے بھی یہ سب کچھ کر سکتا ہے"

اس پر اس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل گئی، گویا کہہ رہی ہو "تم کل کی بچی ہو۔ چند دنوں میں مذہب کے اس نئے کھلونے سے تمہارا جی بھر جائے گا"

اب وہ باآواز بلند کہہ رہی تھی۔ یونیکو یہ مذہب جس کی روشنی آج تمہاری آنکھوں کو خیرہ کر رہی ہے کل تمہیں غیر دلچسپ اور خالی

معلوم دے گا اور پھر تم بدل جاؤ گی اور ہماری ہم خیال بن جاؤ گی۔ تمہاری موجودہ حالت محض وقتی اور عارضی ہے۔"

"نہیں کبھی نہیں کیونکہ خداوند یسوع کے بغیر تو میں جینا بھی پسند نہ کرونگی"، میں نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا۔

"ہاں تم یقیناً بدل جاؤ گی اور اگر آج سے پندرہ سال بعد تم مسیحی ہی رہیں تو تب مجھ سے بات کرنا۔ پھر میں بھی مسیحی ہو جاؤنگی"۔

یہ کہنے کے بعد اسے ہنسی آگئی اور اس کی یہ طنزیہ ہنسی کاغذی پردے کے اس طرف بخوبی سنائی دے رہی تھی۔ بڑے بھائی نے اس کی آواز سنی تو پوچھنے آیا کہ کیا بات ہو رہی ہے۔

پوریکو بولی:

"یونیکو مجھے اپنے خدا کے سامنے گھٹنے ٹیک دینے پر مائل کر رہی ہے"۔

"ہوش کے ناخن لو خاندان میں ایک ہی احمق کافی ہے"۔ وہ غصے سے بولا۔

مذکورہ بالا مکالمے سے اندازہ لگایا جا سکتا کہ میرے گھر والوں کے میرے مذہب کے متعلق کیا نظریات تھے اور میں کسی حد تک اُس کے متعلق ان سے گفتگو کر سکتی تھی۔ بایں ہمہ پوریکو بیشتر وقت میرے ساتھ نہایت صبر و تحمل سے کام لیتی اور مہر و محبت سے پیش آتی رہی مگر بعض دن ایسے بھی آتے جب وہ اپنی تلخی اور چڑچڑے پن کو ظاہر کئے بغیر نہ رہ سکتی تھی۔ اور میرا خیال ہے کہ وہ ایسا کرنے میں حق بجانب بھی تھی۔ بیشتر ازیں کہا جا چکا ہے کہ اُسکی

منگنی اُس کی پسند کے لڑکے سے کر دی گئی تھی۔ لیکن اب اُسکی شادی کے معاملے میں کوئی پیش رفت نہ ہو رہی تھی۔ اور حالانکہ میرے والد نے اپنے منہ سے کچھ نہ کہا تھا مگر میں اور میری بہن دونوں جانتے تھے کہ انہوں نے اس کی شادی کے معاملے کو محض میری خاطر التوا میں ڈال رکھا ہے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ پوریکو کے جانے کے بعد میری دیکھ بھال کا مسئلہ کھڑا ہو جائے گا۔ وہ اکثر کہتے تھے کہ وہ میرے لئے ایک علیحدہ گھر تعمیر کرائیں گے اور اس کی ساخت اور اس میں موجود ساز و سامان ایسا ہوگا کہ میں اس میں اکیلے بھی خود مختارانہ گذر بسر کر سکوں لیکن مہینے گذرتے جا رہے تھے اور انہوں نے اس کام کی بنیاد بھی نہ رکھی تھی۔ اُس وقت پر نظر ثانی ڈالتے ہوئے آج میں یہ محسوس کرتی ہوں کہ وہ اس عرصے میں اس امر کا تیقن کرنا چاہتے تھے کہ آیا میں خود اپنی دیکھ بھال کے قابل ہوئی ہوں یا نہیں۔ لیکن ہم دونوں یعنی میں اور پوریکو اُس وقت اِس بات سے بے خبر تھے اور پوریکو کی طرح خود میں بھی بارہا یہ سوچ کر پریشان ہو جاتی تھی کہ میں اس کی خوشی اور مسرت کے راستے میں حائل ہوں۔ لیکن میں خود بھی اسی قسم کے جال میں گرفتار تھی اور سوچتی تھی کہ میں نہ صرف خود گھر بسا سکتی ہوں بلکہ پوریکو کے راستے کا روڑا بنی ہوئی ہوں لیکن میں اس معاملے میں کچھ نہ کر سکتی تھی۔ لہٰذا کئی دن ایسے بھی آتے جب ہماری ذہنی کوفت اور الجھن ہماری برداشت سے باہر ہو جاتی اور ہم بات بات پر ایک دوسرے سے اُلجھ پڑتے۔ غرض اسی طرح کا دن تھا جب پوریکو گھر کا کام کاج کرتے

خوب تھک گئی تھی۔ وہ میرے پاس آکر بولی:
"آخر مجھے ہی سارا دن کولھو کے بیل کی طرح کام میں جُتے رہنا پڑتا ہے"؟
"خیر جو کچھ میں کر سکتی ہوں وہ میں کرتی ہوں" میں نے اُسی لہجے میں جواب دیا۔
"واقعی؟" پوریکو پیشانی سے ایک پریشان لٹ پیچھے ہٹاتے ہوئے بولی۔
"ہاں اور اگر تم مجھے یہ بتاؤ کہ کیا کروانا چاہتی ہو تو میں وہ بھی کر دوں گی"۔
پوریکو کہہ رہی تھی "تم معبد کی صفائی کرنے کا ذمہ لے سکتی ہو"۔
یہ سنتے ہی میرے چہرے کا رنگ فق ہو گیا اور پوریکو ترش روئی سے بولی:
"لو اب تمہیں کیا ہو گیا ہے"؟
تب میں نے سوچا تھا کہ اُس نے میرے مذہب سے نفرت کی وجہ سے یہ کام کرنے کو کہا ہے، مگر آج یہ جانتی ہوں کہ یہ میری خام خیالی تھی۔ اُسے یہ علم نہیں تھا کہ وہاں کی صفائی کے متعلق میرا ردِ عمل کیا ہو گا۔ بے شک تب تک میں اپنی ٹنڈ منڈ ٹانگوں پر چلنا سیکھ چکی تھی اور گھریلو کام کاج میں بہت حد تک اس کا ہاتھ بٹا سکتی تھی لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں بارہا اپنے اپاہج پن سے ناجائز فائدہ اُٹھاتی اور کام چوری کی مرتکب ہوئی تھی۔ لیکن ہسپتال سے گھر آنے کے بعد آج میں پہلی مرتبہ اس قدر پریشان نظر آ رہی تھی۔

اس لئے نہیں کہ میں کام کرنا نہیں چاہتی تھی بلکہ اس لئے کہ معبد کو صاف کرنا میرے نئے ایمان کے سراسر خلاف تھا۔ میرے چہرے پر کرب اور تذبذب کی روداد پڑھ کر پوریکو بولی:

"یہ تمہیں یکایک سانپ کیوں سونگھ گیا ہے۔ یہ کام مشکل تو نہیں"؟

تب وہ منہ پھیر کر دوسرے کمرے کی طرف لپکی

ٹھہرو "پوریکو"، میں یکایک پکار اٹھی:

"میں جانتی ہوں کہ معبد کی صفائی مشکل نہیں۔ لیکن اگر تم معبد صاف کر دیا کرو تو میں باورچی خانہ یا باتھ روم یا پورے گھر میں جو کام تمہیں سب سے زیادہ نفرت انگیز لگتا ہے وہ کر دیا کروں گی"۔

جب اس نے دیکھا کہ میں خلوص دلی سے ایسا کہہ رہی ہوں تو اس کے انداز میں فرق آگیا۔

"اگر یہ بات ہے تو تم باتھ روم صاف کر دیا کرو مجھے اس کی صفائی کرنا بہت مشکل معلوم ہوتا ہے"۔

غرض یوں باتھ روم کی صفائی میں نے سنبھال لی اور اس نے خاندان کے معبد کو صاف کرنے کی ذمہ داری اٹھالی۔ اس واقعہ کے بعد ہمارے درمیان پہلے سے بھی زیادہ قربت اور انسیت ہوگئی۔ وہ گاہے گاہے مجھے میرے ایمان کے متعلق چھیڑتی اور مذاق کرتی لیکن ہمیشہ علیحدگی میں۔

علاوہ ازیں وہ کبھی کبھی اس بات پر فقرے کستی کہ میں اس کی

شادی کی راہ میں روڑا بنی ہوئی ہوں جس کی وجہ سے اُسکی طبیعت تلخ اور کسی قدر چڑچڑی سی ہو گئی تھی، تاہم میں اس حقیقت سے خوب آگاہ تھی اور گھر میں پہلے سے بھی زیادہ کام کرنیکی کوشش کرتی تھی۔

ایک شام میرے خاندان والوں نے اکٹھے ہو کر متحدہ طور پر مجھ سے یہ مطالبہ کیا کہ میں مسیحی مذہب کو ترک کر دوں اور جب میں نے ایسا کرنے سے پُرزور لہجے میں صاف انکار کر دیا اور اُلٹا اسی وقت مسیح کے متعلق انہیں بتانے لگی تو جلد باز چھوٹا بھائی غصے میں آپے سے باہر ہو گیا اور اس نے میرے منہ پر زناٹے دار تھپڑ دے مارا۔ لیکن اس کے بعد سے اُس نے میرے مسیحی دوستوں کے خلاف میرے سامنے کچھ کہنے کی جرأت نہ کی، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اُس نے مجھ سے بات کرنا ہی چھوڑ دیا۔ خیر میں جانتی تھی کہ وہ گھر کے باہر ایکی توشی اور اس کے مسیحی احباب کے خلاف کیا کیا بے بنیاد اور من گھڑت باتیں کہتا پھرتا ہے۔ لیکن سارے گورکھ دھندے میں ایک بات جو طے تھی اور روزِ روشن کی طرح سب پر عیاں تھی، وہ یہ تھی کہ اگر میرے مسیحی دوست مجھ سے قطع تعلق کر بھی لیں تو بھی اس سے رتی بھر فرق نہ پڑے گا، یعنی اگر میرے گھر والے ان کے ملنے پر پابندی لگا دیں تو بھی میرے خیالات نہیں بدلیں گے۔ میں جانتی تھی کہ مسیح میرے ساتھ ہے اور اُس کی محبت سے کوئی مجھے جُدا نہیں کر سکتا۔

یہ صبر آزما حالات اُلٹا مجھے اپنے ایمان میں مضبوط کر

رہے تھے۔ اور جُوں جُوں میں خدا کی پہچان میں ترقی کرتی گئی میرا دل دوسروں کو اِس ایمان میں شامل کرنے کے لئے بیقرار و بیتاب رہنے لگا۔ مَیں چاہتی تھی کہ مَیں تبلیغ و اشاعت کے کام میں اُسی طرح حصّہ لُوں جس طرح ایکی توشی اور اُس کے مسیحی رفقاء لے رہے ہیں۔ تاہم میں اپنی خامیوں اور مجبوریوں سے آگاہ تھی اور جانتی تھی کہ میں اُن کی طرح گھر گھر جا کر کلام نہیں سنا سکتی۔ لیکن مَیں نے سوچا کہ مَیں سنڈے سکول کی جماعت کو پڑھا سکتی ہوں اور شاید خدائے قادر مجھ سے خدمت لینے کا کوئی اور وسیلہ بھی نکال لے۔ پس میں اِس معاملے میں دُعا کرنے لگی کہ وہ مجھ پر ظاہر کرے کہ آیا وہ واقعی مجھ سے کوئی خاص خدمت لینا چاہتا ہے؟

مَیں نے مسیحی افراد سے سنا تھا کہ خدا نے انہیں کسی خاص آیت کے ذریعے اپنا پیغام دیا لیکن مَیں یہ نہیں جانتی تھی کہ انہیں یہ علم کیونکر ہُوا کہ یہ آیت خاص ان کے لئے ہے۔ مَیں یہ سوچا کرتی تھی کہ اگر خدا نے مجھے کبھی کوئی آیت بخشی تو کیا مَیں جان جاؤں گی کہ یہ میرے لئے ہے! مَیں دعا کیا کرتی تھی کہ اگر خدا کسی آیت کو مجھ سے ہمکلام ہونے یا اپنی مرضی کو مجھ پر آشکارا کرنے کے لئے استعمال کرے تو مَیں اُس آیت کی شناخت کر سکوں۔ مجھے یہ معلوم نہیں کہ مَیں خاص کیا توقع کرتی تھی تاہم اپنے متعلق اُس کی مرضی معلوم کرنے کی میری بڑی خواہش تھی۔ لہٰذا ایک دن میں حسبِ معمول بائبل مُقدّس کی تلاوت کر

رہی تھی کہ یکایک مجھ پر انکشاف ہُوا کہ یونیکو یہ آیت خاص تمہارے لئے ہے۔ میرے تن بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی اور مَیں نے فرطِ جوش سے کپکپاتے ہوئے اُس آیت کی تلاوت کی۔ الفاظ تھے:

"دیکھو میں ایک نیا کام کروں گا۔ اب وہ ظہور میں آئے گا۔ کیا تم اُس سے ناواقف رہو گے؟" (یسعیاہ ۴۳: ۱۹)۔

اِس آیت کو پڑھتے ہی ایک بے پایاں مسرت و شادمانی میری روح کی گہرائیوں تک اترتی چلی گئی۔ میں سوچ رہی تھی .... خدا نے مجھے منظر انداز نہیں کیا۔ میری زندگی عبث اور بے سود نہیں ہوگی۔ خدا مجھ سے کوئی خاص خدمت لینا چاہتا ہے، اور اِس احساس سے میرے بدن میں اِک نئی طاقت اور نئی قوت کی لہر دوڑ گئی۔ میرے لبوں سے خود بخود اور بے اختیار خدا کی حمد و ثنا کے کلمات صادر ہونے لگے۔ کیوں نہ ہو! خدا نے میری پست حالی پر نظر کی تھی۔ اور خدائے عظیم نے اپنی اسکیم میں مجھ جیسی ناچیز کی خدمت کے لئے کوئی جگہ تجویز فرمائی تھی۔

اس واقعہ کے بعد میری سنڈے سکول کی کلاس میں ایسی تبدیلی رُونما ہوئی جس کی مجھے توقع نہ تھی۔ میری مساعی اور کوششوں پر خدا کی خاص برکت تھی۔ سنڈے سکول کی حاضری پہلے کی نسبت بہت زیادہ ہو گئی۔ اور جب مَیں اپنے آپکو ایسے بچوں میں گھرا ہُوا پاتی جو خدا کا کلام سننے کے مشتاق اور خواہشمند تھے تو میرا دل خوشی سے باغ باغ ہو جاتا تھا۔

مجھے یہ معلوم نہیں کہ سب سے پہلے کس کو میرے لئے مصنوعی ٹانگوں کا خیال آیا تھا۔ کم از کم میرے دل میں ایسا خیال کبھی نہیں آیا تھا، اور ایکی توشی کا کہنا ہے کہ اس نے بھی تب تک نہ سوچا تھا۔ بہرحال ان ہی دنوں میں یہ خبر ملی کہ فلاں فلاں مشہور و معروف سرجن اپنے شعبے کی طرف سے عالمی دورے پر ہے تاکہ اس طرح اُن ملٹری افراد کا اپریشن وغیرہ کر سکے جو جنگ میں بُری طرح لنگڑے ہو گئے تھے۔ وہ اپاہجوں کے معالج خصوصی تھے اور انہیں ٹوکیو میں سیونتھ ڈے ایڈونٹسٹ ہسپتال میں قلیل مدت کے لئے قیام کرنا تھا۔

خیر جب اُن کو میری سرگذشت سنائی گئی تو پہلے پہل وہ میری مدد کے لئے آمادہ نہ تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کا اوّلین فرض امریکن سپاہیوں کی مدد کرنا ہے۔ وہ اس مختصر میعاد میں جنگ سے متاثرہ کیسوں سے بھی خاطر خواہ طور پر عہدہ برآ نہ ہو سکتے تھے اور میرا کیس تو بالکل فرق نوعیت کا تھا۔ میں اُن کی توجہ کی کسی طور حقدار نہ تھی کیونکہ میں نہ امریکن تھی نہ جنگ سے میرا کوئی واسطہ یا تعلق تھا۔ لیکن ایکی توشی ٹھہرا اور اس کے دوست ڈاکٹر کا انکار قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔ انہوں نے اس سلسلے میں دعا اور التجا کو جاری رکھا اور کچھ دیر بعد دوبارہ ڈاکٹر سے ملاقات کی اور ڈاکٹر صاحب کو آخر کار مجھے دیکھنے پر رضامند کر ہی لیا۔ لیکن یہ رضامندی انہوں نے اُن کے بار بار اصرار کرنے پر دی تھی اور انہیں صاف صاف بتا دیا تھا کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ مصنوعی اعضا لگانے سے پہلے درکار اپریشن بھی کریں گے۔ وہ صرف میرا معائنہ

کریں گے، اور یہ سب کچھ بتا کر بولے:

"سچ تو یہ ہے کہ نجانے میں اتنا بھی کیوں کر رہا ہوں کیونکہ میرے پاس سر کھجانے کی فرصت نہیں۔"

تو جب میں معائنہ کے کمرے میں پہنچی تو ڈاکٹر صاحب نے اندر آ کر دروازہ بند کر لیا گویا وہ جلد از جلد اتنے ناگوار مرحلے کو طے کرنا چاہتے ہوں۔ پھر وہ کرسی پر بیٹھ گئے اور انہوں نے میرے بائیں بازو کے ٹنڈ کو دیکھا۔

"یہ اپریشن کس نے کیا تھا؟" انہوں نے سوال کیا

جب میں نے انہیں مشہور سرجن کا نام بتایا تو انہوں نے اُسے دوبارہ غور سے دیکھا اور بولے "بہت خوب! انہوں نے بہت عمدگی سے یہ کام کیا ہے۔ میں اس کی تصویر لینا چاہتا ہوں۔"

بعد ازاں انہوں نے میری ٹانگوں کا بھی معائنہ کیا۔ وہ بھی فن جراحی کی مہارت کی مثال تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ مصنوعی اعضا کو "فٹ" کرنے کے لئے میرے متاثرہ اعضا کو مزید اپریشن کر کے تیار کرنا ہوگا۔ اور اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد فرمایا

"تمہیں مجھے اپریشن کی فیس دینے کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں، البتہ ہسپتال والوں کا بل ضرور دینا پڑے گا۔"

غرض یوں میرا نام اس ہسپتال میں اپریشن کے منتظر افراد کی فہرست میں درج کر لیا گیا اور طے پایا کہ میرے اپریشن کا دن اور وقت مقرر ہونے پر وہ مجھے بذریعہ فون اطلاع کر دیں گے۔ ہم ان کے رجسٹر میں اپنی توشی کا فون نمبر درج کروانے کے بعد واپس

چلے آئے کیونکہ میرے والد کو تا حال اِس سلسلے میں ہماری دوڑ دھوپ کا کوئی علم نہ تھا۔ ہسپتال سے واپسی پر میرا دل خدا کے لئے جذبۂ تشکر سے لبریز تھا کیونکہ مجھے احساس تھا کہ خدا نے ایک مرتبہ پھر میرے لئے ایسا سرجن مہیّا کیا ہے جس کا شمار دنیا کے بہترین سرجنوں میں ہوتا ہے۔ مَیں آج تک یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ خدا نے مجھ پر اپنی رحمت و شفقت کیوں کی!

اِس کے بعد چند دن ہسپتال سے فون کال کے اِنتظار میں گذرے اور جب ہسپتال کے بزنس آفس سے ٹیلیفون کال آئی تو اَیکی توشی نے ریسیور اٹھایا۔ وہ کہہ رہا تھا:

"جی۔ جی، مَیں یوُنیکو اور اُس کے خاندان والوں کو جانتا ہوں۔ جی ہاں مجھے معلوم ہے کہ اپریشن کے لئے اس کا نام ہسپتال کی فہرست میں درج کر لیا گیا تھا۔ آپ مطلق فکر نہ کریں۔ وہ ضرور وقت مقررہ پر اپریشن کے لئے ہسپتال میں موجود ہوگی۔ مَیں اُسے وقت پر وہاں پہنچانے کا ذمہ لیتا ہوں۔"

"کیا آپ جانتے ہیں کہ اُسے ہسپتال کا بِل داخل ہونے سے پہلے ادا کرنا ہوگا۔"

"جی ہاں مجھے معلوم ہے۔"

"کیا آپکے پاس بل کی ادائیگی کے لئے رقم موجود ہے۔"

"جی ہاں۔ بالکل۔"

اِس کے بعد اُس نے ریسیور کو جلدی سے اُس کی جگہ پر رکھ دیا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ گھبراہٹ کی شدّت سے کانپ رہا تھا۔ نجانے

کیوں اُس نے ہسپتال والوں کو یہ کہہ دیا تھا کہ بل کی ادائیگی کے لئے رقم موجود ہے جبکہ اس کی جیب میں اِس مد پر خرچ کرنے کے لئے پھوٹی کوڑی نہ تھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ ایکی توشی نے غلط بیانی سے کام لیا تھا جو غلط اقدام تھا تو اس کی ذمہ دار میری ذات تھی۔ اُسے میرے آرام و آسائش کا اس قدر احساس تھا اور خدا کی قدرت میں اُس کا ایمان اِس قدر قوی تھا کہ وہ سوچتا تھا کہ اگر یہ ممکن ہے کہ میں مصنوعی ٹانگوں کے استعمال سے عام لوگوں کی طرح چل پھر سکوں تو کوئی وجہ نہیں کہ میں ٹنڈ منڈ ٹانگوں پر رینگتی پھروں۔ نیز اس نے بعد ازاں مجھ سے کہا تھا۔ "مجھے تمہارے لئے مصنوعی اعضا حاصل کرنے کی اس قدر تمنا تھی کہ میں اُس وقت کوئی وعدہ بھی کر ڈالتا۔"

لیکن آج وہ محسوس کرتا ہے کہ خُدا ہی نے اُسے اس دن ہسپتال کی انتظامیہ کو یہ جواب دینے پر اکسایا تھا۔ کیونکہ ہم سب اِس سارے معاملے کو خدا کے ہاتھ میں سونپ چکے تھے اور یقین کرتے تھے کہ وہی اِس ضمن میں ہر درکار شے مہیا کرے گا۔ قصہ کوتاہ یہ کہ معاملہ اب یہاں تک پہنچ چکا تھا۔ ہسپتال والوں کو بل کی ادائیگی کا اطمینان دلا دیا گیا تھا اور حقیقت یہ تھی کہ ہمارے پاس پیسہ موجود نہ تھا لیکن سب کو خدا کی لامحدود اور قدرتِ کاملہ پر یقین و ایمان ضرور تھا۔

اُس اتوار کو چرچ میں پاسٹر صاحب نے میرا معاملہ اپنی کلیسیا کے سامنے پیش کیا اور اِس سے پیشتر کہ ہم چرچ کی عمارت سے باہر قدم

رکھتے بہت سے افراد نے اس سلسلے میں امداد کا وعدہ کیا۔ موعودہ رقم میرے اپریشن کے لئے کافی تھی۔ لیکن تاحال میں نے اپنے والد سے اپریشن کے متعلق کوئی بات نہ کی تھی اور اُن سے اجازت لینا ضروری تھا۔ اب صرف یہی چیز راستے میں حائل تھی۔ جب اُن سے اس معاملے میں تفصیلی بات چیت کی گئی تو وہ مخمصے میں پڑ گئے۔ اوّل تو وہ اس اپریشن کے حق میں نہ تھے غالباً انہیں اس کی پوری کامیابی کا یقین نہیں تھا اور ان کا کہنا تھا کہ میں پہلے ہی کافی جسمانی تکلیف اُٹھا چکی ہوں اور میری موجودہ حالت اتنی اچھی نہیں کہ اس کے لئے مزید جسمانی تکلیف، ذہنی کوفت مایوسی اور ناکامی کا خطرہ مول لیا جائے۔ دیگر میرے اپریشن کے لئے دوسرے لوگوں سے مالی امداد قبول کرنے کا خیال ہی انکے لئے بہت تکلیف دہ تھا۔ میرا چھوٹا بھائی جو غصّے میں لال پیلا ہو رہا تھا بولا:

"آپ مانیں نہ مانیں۔ اس میں کوئی راز کی بات ضرور ہے۔ بھلا وہ ہماری یونیکو کے لئے دوسروں کے سامنے کیوں ہاتھ پھیلا رہے ہیں۔ اس ساری کارروائی کے پس پردہ ان کی اپنی کوئی مذموم اسکیم موجود ہے۔ بھلا آپ ہی سوچیں کہ وہ یونیکو پر اتنے مہربان کیوں ہیں؟ والد حضور! یہ سارا معاملہ آپ کے لئے ندامت اور سارے خاندان کے لئے بیعزتی کا باعث ہے۔ اس حماقت کو بھول جانا ہی مصلحت ہوگی۔"

لیکن گو میرے والد اپریشن کے حق میں نہ تھے۔ تاہم اُنکے انکار کی وجہ اور تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں دوبارہ ناکامی

کا سامنا کروں۔ اب وہ کہہ رہے تھے:

"میں یونیکو کے مسیحی دوستوں پر اور خصوصاً ایکی توشی طہارا پر اعتماد کرتا ہوں۔ وہ کسی معیوب کام یا اسکیم میں ملوث نہ ہونگے ایکی توشی قابل اعتماد اور قابل احترام شخص ہے۔ وہ مہذب اور مہربان طبع ہے اور اپنے والدین کا قابل ناز سپوت ہے۔

"لیکن مت بھولئے کہ وہ بھی کرسچن ہے۔ وہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ وہ ہماری بہن کو اپنے نفع کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔"

میرے والد پُرتحمل لہجے میں بولے

"ہم ان کے احسان مند اور ممنون ہیں۔ میں یہ کبھی فراموش نہیں کر سکتا کہ اُن مسیحیوں کے ساتھ ملاقات سے پہلے یونیکو کی رُوح مُردہ ہو چکی تھی اور اب اس کے لبوں پر تبسم اور اس کی آنکھوں میں امید کی چمک ہے۔ اور مجھے اُسے یوں دیکھ کر دلی خوشی ہوتی ہے۔"

"ہائیں! کیا انہوں نے یونیکو کی طرح آپ پر بھی جادو کر دیا ہے؟ میں پھر کہتا ہوں کہ وہ ہم سب سے کوئی بات چھپا رہے ہیں۔ چار دن صبر کر کے دیکھئے۔ کوئی نہ کوئی بات کھل کر سامنے آجائے گی اور تب آپ پر واضح ہو جائے گا کہ وہ اپنا الّو سیدھا کرنے کی فکر میں تھے۔ میری مانیں اور اُن سے کہدیں کہ ہمیں ان کے پیسوں کی ضرورت نہیں۔"

اس پر والد اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے ہاتھ انکی جیبوں

میں ٹھونسے ہوئے تھے۔ وہ بولے :

"ہسپتال کا بل تو میں خود بھی ادا کر سکتا ہوں۔"

"ہمیں ان کے پیسے کی ضرورت ہے نہ ان کے اپریشن کی" چھوٹا بھائی نے پھنکارتے ہوئے کہا

لیکن والد نے میرے بھائیوں کی مخالفت کے باوجود اپریشن کی اجازت دیدی حالانکہ وہ خود اس اپریشن کی ضرورت محسوس نہ کرتے تھے۔ اور چونکہ میں نے ان کی منت کر کے درخواست کی تھی کہ وہ بل کی ادائیگی کا فکر نہ کریں تو انہوں نے میری وہ بات بھی مان لی۔ چھوٹے بھائی کو آج تک یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ انہوں نے پیسے قبول کرنے کی کس طرح اجازت دیدی، کیونکہ کوئی باعزت جاپانی خاندان قابلِ نفرت کرسچن لوگوں سے خیراتی رقم قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ یہ ہمارے خاندان کے نام پر دھبہ تھا۔ لیکن میرے والد نے میرے اصرار پر اجازت دے دی اور میرے بھائی اس سلسلے میں احتجاج کرتے اور دانت پیستے رہ گئے۔

تاہم چھوٹے بھائی کی متواتر مخالفت اور لگاتار دباؤ رنگ لائے بغیر نہ رہ سکا۔ والد صاحب نے مجھے صاف صاف الفاظ میں کہہ سنایا کہ اگر میں اپنے مسیحی دوستوں کے ساتھ راہ و رسم کو برقرار رکھنے اور مسیحی رہنے پر مُصر رہی تو اس صورت میں میرا جیب خرچ بند کر دیا جائے گا وہ صرف مجھے خوراک، تن ڈھانپنے کو کپڑا اور سر چھپانے کو جگہ مہیا کریں گے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ میں نے جیب خرچ کے بغیر گذر بسر کرنے کو ترجیح دی۔

اُنہی دنوں میں ایکی توشی کے سُننے میں یہ آیا کہ گورنمنٹ اپاہج لوگوں کو کچھ مالی امداد مہیّا کر رہی ہے۔ لہٰذا اس کے دوست اُس کے ساتھ اِس امر سے متعلق مزید معلومات حاصِل کرنے گئے۔ جب وہ اِس ضمن میں قطار میں کھڑے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے تو ایکی توشی نے اپنے دوست سے یکایک سوال کیا۔

"کیا تم سوچتے ہو کہ یونیکو شادی کر سکتی ہے"؟

"ہاں میرا خیال ہے کہ وہ شادی کر سکتی ہے۔ لیکن اس سے شادی کرنے والے شخص کو بہت مہربان طبع اور مفاہمت پسند ہونا چاہیئے۔ یقیناً یونیکو کسی اچھے مسیحی نوجوان کے لئے عمدہ بیوی ثابت ہو سکتی ہے"

ایکی توشی کا یہ دوست اور اُس کی بیوی اس موضوع پر یعنی میری شادی کے بارے میں بات چیت کر چکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے برجستگی سے اس کے سوال کا جواب دیا تھا، اور اُسی لمحے سے وہ جان گیا کہ ایکی توشی کی سوچوں کا دھارا کس سمت میں بہہ رہا ہے حالانکہ خود ایکی توشی شعوری طور پر اس امر سے آگاہ نہ تھا۔ شاید اس وقت سے ایکی توشی کے دل میں مجھ سے شادی کرنے کا خیال جڑ پکڑنے لگا۔

بعد ازاں جلد ہی مجھ پر یہ حقیقت عیاں ہو گئی کہ اس کا کیا ارادہ ہے۔ بے شک میں یہ بتا نہیں سکتی کہ یہ اصلیت مجھ پر کس طرح آشکارا ہوئی۔ صرف اتنا کہہ سکتی ہوں کہ میں اپنے متعلق اس کے لطیف جذبات اور احساسات سے بخوبی آگاہ تھی۔ اُدھر میں

بھی شادی کے مسئلے پر اپنے آپ سے گویا جنگ کرتی رہی تھی، اور اس فیصلے پر پہنچی تھی کہ زندگی کا کٹھن سفر مجھے تن تنہا ہی طے کرنا ہوگا۔ لیکن جن دنوں میں میں اپریشن کے لئے ہسپتال میں داخل تھی تو ایک دن ایکی توشی نے مجھ سے کہا:

"یونیکو میں تم سے ایک خاص معاملے پر بات کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن میں ابھی اس کے متعلق بات کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔"

"تمہیں الفاظ کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہارے جذبات کو جانتی ہوں اور میرے اپنے احساسات بھی کچھ ایسے ہی ہیں۔"

اور اس جواب پر میں خود بھی دنگ رہ گئی تھی۔ اور اس کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم اس معاملے میں خدا سے راہنمائی حاصل کرنے کے لئے دعا کرتے رہیں گے۔ اور اس سے التجا کریں گے کہ وہ اپنے پاک کلام کے ذریعے ہم پر اس ضمن میں اپنی مرضی کو آشکارا کرے۔ اور دو دن بعد خدا نے ہم دونوں کو ایک ایک آیت عطا فرمائی۔ لہٰذا اگلی مرتبہ جب ایکی توشی ہسپتال آیا تو اس نے ایک لفافہ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس لفافے میں ایک پرچی پر وہ آیت لکھی تھی جو خدا نے اسے دعا کے جواب میں عطا کی تھی۔ جب میں نے اس آیت کو پڑھا تو میں فرطِ جذبات سے کپکپا اٹھی کیونکہ خدا نے مجھے بھی عین وہی آیت بخشی تھی۔ آیت مذکورہ کے الفاظ تھے "اگر تم میں سے دو شخص زمین پر کسی بات کے لئے جسے وہ چاہتے ہوں اتفاق کریں تو

وہ میرے باپ کی طرف جو آسمان پر ہے اُن کے لئے ہو جائیگی۔"
اصولاً مجھے اس امر سے خوش اور شکر گذار ہونا چاہیئے تھا کہ خدا ہماری راہنمائی کر رہا ہے۔ لیکن حقیقت حال یہ تھی کہ میں اپنے آپ کو نئے موڑ پر کھڑے پاکر سٹپٹا گئی۔ کیونکہ شادی کے مسئلے سے گویا ہاتھا پائی کے بعد میں خود ہی خدا کی راہنمائی حاصل کئے بغیر شادی نہ کرنے کا عزم کر چکی تھی۔ لہٰذا جب اس دن ایکی توشی نے شادی کے موضوع پر بات چھیڑی تو میں کسی قدر ترش لہجے میں بولی
"یہ عمر بھر کا مسئلہ اور معاملہ ہے۔ میں جذبات کی رَو میں بہہ کر جلد بازی سے کوئی فیصلہ کرنا نہیں چاہتی۔ خود ہی سوچو کہ پورے انگ اور اعضا والی عورتوں کے لئے بھی بیوی اور ماں بننا آسان نہیں تو میں کس شمار میں ہوں۔ مجھے یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آتی۔ نہیں یہ تمہاری خوش فہمی یا خام خیالی ہے۔"
اس پر اس نے مجھے ابرہام اور سارہ کی کہانی سنا کر میری حوصلہ افزائی کرنے کی کوشش کی اور مجھے یاد دلایا کہ وہ دونوں اتنے ضعیف اور عمر رسیدہ تھے کہ وہ اولاد سے نا امید ہو چکے تھے تاہم خدا نے اُن کو بیٹا بخشنے کا وعدہ کیا۔ اور اگرچہ سارہ اولاد پیدا کرنے والی عمر سے تجاوز کر چکی تھی وہ خدا کے قول کے مطابق امید سے ہوئی اور اس کے بطن سے اضحاق پیدا ہوا۔ اس کے بعد وہ کسی قدر توقف کے بعد بولا:
"یونیکو ہم اُسی قادر خدا کی پرستش کرتے ہیں۔ وہ قدیر ہماری

شادی کو بھی کامیاب بنا سکتا ہے۔"

اس قسم کی گفتگو کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُسکے سامنے تو میں اپنے آپکو پُر اُمید اور پُر عزم پاتی لیکن اس کے چلے جانے کے بعد میرے دل میں طرح طرح کے وسوسے سر اٹھانے لگتے اور میری ہمت کی کمر ٹوٹ جاتی۔ اور میں اپنے آپ سے کہتی

"بی بو نیکو، شادی تمہاری زندگی کی اسکیم میں شامل نہیں ہو سکتی۔"

لہٰذا دوبارہ ملاقات ہونے پر میں اُسے اپنے خیال سے آگاہ کرتی۔ اس صورتِ حال پر اس نے ایک دن مجھ سے کہا

"اگر تمہارے ایسے ہی خیالات ہیں تو میں تمہیں جلدی فیصلہ کرنے کے لئے مجبور کرنا نہیں چاہتا۔ میں انتظار کر سکتا ہوں۔ لیکن یاد رکھو کہ ہم خدا کی اسکیم اور عزم کو بدل نہیں سکتے۔ ذاتی طور پر میں اس امر کا قائل ہو چکا ہوں کہ یہ اس کی رضا ہے کہ ہم زندگی کے سفر میں ایک دوسرے کے ساتھی ہوں۔ لہٰذا میں انتظار کرتا رہوں گا۔"

اس کی ایسی باتوں سے بارہا میں تلملا اُٹھتی تھی کیونکہ میں جانتی تھی کہ اس طرح میرا فیصلہ متزلزل ہو جاتا تھا۔ خیر کچھ دنوں تک اس نے اس کے متعلق کچھ نہ کہا اور صبر اور خاموشی سے انتظار کرتا رہا۔ اس طرح وہ وقت بھی آگیا جب میں نے جان لیا کہ وہ ٹھیک ہی کہتا تھا۔ یقیناً خدا اس ساری مدت

ہیں ہماری راہنمائی کر رہا تھا۔
جب مجھے اِس اپریشن کے بعد ہسپتال سے چھٹی ملی تو میں مصنوعی اعضا فِٹ کروانے کے لئے گئی۔ اور جب میں اِک عرصے بعد اپنی نئی ٹانگوں پر کھڑی ہوئی تو میری خوشی بے بیان تھی۔ میں اُس بچے کی طرح محسوس کر رہی تھی جو معجزانہ طریقے سے آناً فاناً بالغ ہو گیا ہو۔ بے شک نئی ٹانگوں کے صحیح استعمال کو سیکھنا بھی صبر طلب اور وقت طلب مرحلہ تھا مگر میں خوش تھی کہ میں پھر سیدھی کھڑی ہو سکتی ہوں اور ایکی توشی کے شانہ بشانہ چل سکتی ہوں۔
مجھے آج تک وہ شام بخوبی یاد ہے ہم دونوں اکٹھے والد کے پاس گئے تھے کہ انہیں شادی کے متعلق اپنے فیصلے سے آگاہ کریں اور اُن سے اُن کی دُعائیں اور برکات کی درخواست کریں۔ میرے والد اِس خبر پر بے طرح خوش ہوئے تھے! اُنہوں نے مجھے کچھ عجیب نگاہوں سے دیکھا تھا جس میں حیرت اور خوشی گڈمڈ ہو گئی تھی۔ پھر اُن کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا، کیونکہ اِس سے پیشتر میں نے ان کی آنکھوں کو کبھی پُرنم نہ دیکھا تھا، حتیٰ کہ میری والدہ کے جنازے پر بھی انہوں نے آنسو نہ بہائے تھے۔ اور اب وہ اپنی کپکپاتی آواز پر قابو پاتے ہوئے کہہ رہے تھے:
"بہت خُوب۔ بہت خُوب۔ میں بہت خُوش ہوں۔ ایکی توشی اس کا خوب خیال رکھنا۔"

ایمان کی گواہی دینے کے نئے مواقع میسّر آئے ہیں وہاں یہ فلم اُسکے اِس اعتقاد کے اظہار کا موثر ذریعہ بھی ثابت ہوئی ہے کہ صرف خداوند یسوع مسیح ہی انسان کی سچّی امید و پناہ گاہ ہے۔

فی زمانہ دنیا میں کروڑہا لوگ ایسے ہیں جو زندگی کو بے لُطف، خالی اور روکھا پھیکا پا کر دل برداشتہ ہو چکے ہیں اور یونیکو کی طرح اس آزمائش کا سامنا کر رہے ہیں کہ خودکشی کر کے اِس زندگی کے جھمیلوں سے فرار حاصل کر لیں۔ یونیکو کی داستان ایسے افراد کے لئے روشنی کا مینار اور اِس امر کی زندہ مثال ہے کہ اس دنیا کے موجودہ ماحول میں بھی ایک بہتر اور سچّا طرزِ زندگی اختیار کیا جا سکتا۔ اور یہ طرزِ عمل زندہ خُدا پر ایمان لانے سے اپنایا جا سکتا ہے۔ ہاں اسی زندہ خدا پر ایمان لانے سے جس کا ظہور بنی نوع اِنسان پر خداوند یسوع مسیح کے وسیلے کیا گیا۔